ماہنامہ
جہدِ حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

Registered No. CPL-13

جلد نمبر33...شمارہ نمبر...10...اکتوبر2025



ایچ آر سی پی شکایات سیل

ایچ آر سی پی شکایات سیل نے 1985ء میں کام شروع کیا جب کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے میں ایسا مخصوص سیل موجود نہیں تھا جو مظلوم لوگوں کی شکایات وصول کرتا ہو۔اس وقت سے،ایچ آر سی پی پاکستان بھر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لئے جدو جہد میں مصروف ہے۔

ایچ آر سی پی شکایت سیل کو ماہانہ سینکڑوں شکایات موصول ہوتی ہیں۔ہم جونہی خواتین کے خلاف تشدد،محکمہ جاتی مسائل،اقلیتوں کے حقوق، جبری شادیوں، جبری تبدیلی مذہب، جبری گمشدگیوں، سائبر جرائم اور دیگر تمام انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق شکایات وصول کرتے ہیں اور اس پر ایکشن لیتے ہیں۔تاہم، مالی معاونت، سیاسی پناہ، جائیداد کے تنازعات یا ذاتی تنازعات سے متعلق شکایات ہمارے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

طریقہ کار

جیسے ہی ہمیں شکایات موصول ہوتی ہیں ہم متعلقہ حکام سے رابطہ کرتے ہیں اور کیس پر کارروائی کا آغاز کردیتے ہیں۔ہمارا بہت سے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ساتھ ایک براہ راست ریفرل نظام موجود ہے جس کا مقصد شکایت کے فوری ازالے کو یقینی بنانا ہے۔

ہم سے رابطہ کریں

اگر آپ نے کوئی شکایت درج کرانی ہے تو ہمیں کال کرسکتے ہیں، واٹس ایپ کرسکتے ہیں، ای میل بھیج سکتے ہیں یا خط ارسال کرسکتے ہیں۔
آپ اپنے قریبی ایچ آر سی پی شکایات ڈیسک میں بذات خود جا کر شکایت رجسٹر کرواسکتے ہیں اور کمپلینٹ آفیسر سے بذات خود بات کرسکتے ہیں۔

لاہور	کراچی	پشاور
ایوان جمہور۔107 ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 فون : +92 42 3586 4994, 3583 8341, 3586 5969 ای میل : hrcp@hrcp-web.org ویب سائیٹ : www.hrcp-web.org مرکز شکایات سیل فون : +92 042 3584 5969 موبائل : +92 0321 341 4884 ای میل : complaints@hrcp-web.org	یونٹ نمبر 08، فلور 1 سٹیٹ لائف بلڈنگ نمبر 5 (الاکو ہاؤس) عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی۔74400 فون : +92 21 3563 7131, 3563 7132 شکایات سیل (موبائل) : +92 315 111 6287 ای میل : karachi@hrcp-web.org	43 گلشن اقبال لین (نزد ارباب روڈ سٹاپ) یونیورسٹی روڈ، پشاور فون : +92 091 584 4253 شکایات سیل (موبائل) : +92 0318 950 0640 ای میل : peshawar@hrcp-web.org

اسلام آباد	کوئٹہ	حیدرآباد
آفس B-1، فلور 2 بلاک ڈی-12، (اوپر فیصل بینک) جی 8، مرکز، اسلام آباد فون : +92 51 835 1127 شکایات سیل (موبائل) : +92 333 569 4773 ای میل : islamabad@hrcp-web.org	فلیٹ نمبر C-6 کبیر بلڈنگ ایم۔اے جناح روڈ، کوئٹہ فون : +92 81 282 7869 شکایات سیل (موبائل) : +92 306 294 6125 ای میل : quetta@hrcp-web.org	306- فائزہ آرکیڈ، (لوفٹ اینڈ میزانائن فلور) نزد مسجد حاجی شاہ بخاری درگاہ صدر کنٹونمنٹ، حیدرآباد فون : +92 22 278 3688, 720 770 فیکس : +92 22 278 4645 شکایات سیل (موبائل) : +92 310 339 2222 ای میل : hyderabad@hrcp-web.org

ملتان	گلگت	تربت/مکران
2511/5A ابدالی کالونی نزد بریٹین سکول ملتان فون : +92 61 451 7217 شکایات سیل (موبائل) : +92 331 665 5529 ای میل : multan@hrcp-web.org	آفس نمبر 8-9، رانگ یل پلازہ جماعت خانہ روڈ، ذوالفقار آباد کالونی، جتیال، گلگت موبائل : +92 0344 547 5553 شکایات سیل (موبائل) : +92 355 454 1088 ای میل : gilgit@hrcp-web.org	پرواز ہاؤس، بالمقابل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پسنی روڈ، تربت، کیچ فون : +92 852 413 365 شکایات سیل (موبائل) : +92 323 234 2406 ای میل : turbat@hrcp-web.org

فہرست

نوآبادیاتی اثرات سے آزاد قانون انسانی حقوق کے فروغ کے لیے ناگزیر ہے: ایچ آر سی پی

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے زیرِ اہتمام ''قانون کو نوآبادیاتی اثرات سے آزاد کرنا: پاکستان میں انسانی حقوق اور قانونی اصلاحات'' کے عنوان سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں وکلا، صحافیوں، ماہرینِ تعلیم اور انسانی حقوق کے علمبرداروں نے اس بات کا جائزہ لیا کہ اکستان کے عدالتی اور سیاسی ڈھانچے میں نوآبادیاتی قانون کی جھلک اب تک نمایاں ہے، جس کا ایک بھاری خمیازہ کمزور طبقات کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ایچ آر سی پی کے چیئر پرسن اسد بٹ نے یاد دلایا کہ آزادیوں کو محدود کرنے والے قوانین اسمبلیوں سے فوراً منظور ہو جاتے ہیں، جب کہ مفادِ عامہ کے قوانین التوا کا شکار رہتے ہیں۔ ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق نے زور دیا کہ نوآبادیاتی نظام نے معاشروں کو بالادست اور پسماندہ طبقات میں تقسیم کر دیا ہے اور عوام کے ساتھ شہریوں کے بجائے رعایا جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

جسٹس (ر) مقبول باقر نے اپنے خطاب میں کہا کہ پاکستان کا عدالتی نظام اب بھی اس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے کہ لوگوں کو کنٹرول کیا جائے، نہ کہ ان کے حقوق کا تحفظ۔ انہوں نے اختلافِ رائے کو جرم قرار دینے والے قوانین کے خاتمے، انسانی ہمدردی کو قانونی عمل کا حصہ بنانے اور عدلیہ کی آزادی کے تحفظ پر زور دیا۔

ابتدائی سیشن میں وکیل سارہ ملکانی نے واضح کیا کہ بغاوت اور امتناعی حراست کے قوانین نوآبادیاتی حکمتِ عملی کا تسلسل ہیں، جبکہ محقق نازش بروہی نے نشاندہی کی کہ ریاست کا جاری ''تہذیب سکھانے کا مشن'' دراصل نوآبادیاتی ورثہ ہے۔ صحافی اکبر نوتیزئی نے نشاندہی کی کہ بلوچستان کو اب بھی ''نوآبادی'' سمجھا جاتا ہے، جہاں وسائل کی لوٹ مار اور وسیع پیمانے پر جبری گمشدگیاں جاری ہیں۔ وکیل اسفند یار وڑائچ نے اجتماع کی آزادی کو ''تمام حقوق کا مرکز'' قرار دیتے ہوئے پرامن احتجاج پر قدغن لگانے والے نئے قوانین پر تشویش کا اظہار کیا۔

بعدازاں تین موضوعاتی نشستوں میں شرکاء نے اپنی اپنی تحقیق کے خلاصے پیش کیے۔ اظہارِ رائے کی آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے ڈیجیٹل حقوق کی کارکن فریحہ عزیز اور وکلا مومنہ توفیق، سمرا سہیل، صبغت شیخ اور اسفند کھچیلا نے نشاندہی کی کہ پیکا اور بغاوت کے قوانین کو دباؤ کے آلے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایچ آر سی پی کے کونسل رکن سہیل سنگی نے کہا کہ ڈیجیٹل جبر دراصل ''پریس پر نوآبادیاتی پابندیوں کی جدید شکل'' ہے۔

وکلاء عبیرہ اشفاق اور مدثر فاروق، ثقافتی حقوق کی ماہر سعدیہ فاروق عظیمی اور ایچ آر سی پی کی کونسل رکن سعدیہ بلوچ نے ضابطہ فوجداری، اراضی کے حقوق اور سماجی ضبط میں نوآبادیاتی اثرات کا جائزہ لیا۔ انہوں نے تعلیمی اصلاحات، امتیازی قوانین کے خاتمے اور انسانی ومقامی اصولوں پر مبنی قانون کی نئی تعریف پر زور دیا۔

ایچ آر سی پی کے اسٹاف ممبر سلمان فرخ اور وکیل علیزہ مسعود نے واضح کیا کہ نوآبادیاتی قوانین نے جبری شادی اور عورتوں کی رضا سے انکار کو استحکام بخشا ہے، جبکہ وکیل حریم گودیل نے بتایا کہ توہینِ مذہب کی دفعات استعماری دور میں متعارف ہوئیں اور آج تک ان کا غلط استعمال جاری ہے۔ ایچ آر سی پی کی کونسل رکن مہناز رحمان نے خواتین کی جدوجہد کو واضح کیا جو نوآبادیاتی اور پدرشاہی ڈھانچوں کے خلاف ہے۔ وکیل صلاح الدین احمد نے عدلیہ میں حساسیت پیدا کرنے اور خواتین واقلیتوں کے خلاف قوانین کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے حفاظتی اقدامات تجویز کیے۔

اپنے اختتامی کلمات میں ایچ آر سی پی کی سابق چیئر پرسن حنا جیلانی نے کہا: ''ہم نہ تو نوآبادیاتی اور نہ ہی مقامی آمریت کی روایات کو تھامے رکھ سکتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کو انصاف اور مساوات کا عکاس ہونا چاہیے۔''

کانفرنس کے اختتام پر سندھ اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر انتھونی نوید نے کہا کہ مذہبی برادریوں کے حقوق اور آزادیوں سے متعلق مسودہ قوانین پر تنقید ضروری ہے تا کہ یہ قوانین کمزور طبقات کے لیے رکاوٹ بننے کے بجائے ان کے تحفظ کا ذریعہ بن سکیں۔

[پریس ریلیز۔ کراچی۔ 04 ستمبر 2025]

سیلاب سے ہونے والی تباہی انتظامی غفلت کی عکاس ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو ملک بھر میں آنے والے تباہ کن سیلابوں پر سخت تشویش ہے۔ خاص طور پر جنوبی پنجاب، خیبر پختونخوا کے بعض حصوں اور گلگت بلتستان سے موصول ہونے والی اطلاعات انسانی جانوں اور مال واسباب کے وسیع پیمانے پر نقصان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ آفات اب محض 'قدرتی' نہیں رہیں بلکہ یہ انسانوں کی پیدا کی ہوئی ہیں جس کی وجہ ناقص منصوبہ بندی، زمینوں پر قبضے، جنگلات کی کٹائی، بدعنوانی اور ماحولیاتی غفلت ہے، جس کی ذمہ داری ریاست اور یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔

اگرچہ امدادی سرگرمیاں جاری ہیں، تاہم ایچ آر سی پی اس بات پر زور دیتا ہے کہ ان کوششوں کو فوری طور پر بڑھایا جائے۔ مزید امدادی ٹیمیں تعینات کی جائیں اور زیادہ کیمپ قائم کیے جائیں جہاں خوراک، پناہ گاہ، صاف پانی اور طبی سہولتوں تک منصفانہ رسائی یقینی بنائی جائے۔ سب سے زیادہ کمزور طبقات ——خواتین، بچے، بزرگ اور معذور افراد—— پر خصوصی توجہ دی جائے۔

یہ سیلاب ماحولیاتی پناہ گزینوں کی حالت زار کو بھی اجاگر کرتے ہیں، جو اپنے گھر اور روزگار چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ ان بے گھر افراد کو طویل المدتی بحالی کے منصوبوں کے ذریعے تسلیم کرے اور رہائش اور روزگار کے مواقع کے ذریعے ان کی بحالی نو کو یقینی بنائے۔ بصورت دیگر غربت، محرومی اور سماجی بے چینی میں اضافہ ہوگا۔

اگلے مرحلے میں اس کے سنگین نتائج سامنے آئیں گے، جن میں خوراک کی مہنگائی، شہروں کی طرف ہجرت اور پہلے سے دباؤ کا شکار شہری انفراسٹرکچر کا انہدام شامل ہے۔ وسیع زرعی زمین زیرِ آب آنے اور فصلوں کی تباہی کے باعث خوراک کی ترسیل کا نظام متاثر ہوگا، جو ایک معاشی اور انسانی بحران کا باعث بنے گا۔

ایچ آر سی پی حکومت کو خبردار کرتا ہے کہ غیر مربوط اقدامات ناکافی ہوں گے۔ اس وقت مکمل وسائل سے لیس، بااختیار اور فعال مقامی حکومتوں کی ضرورت ہے تاکہ مقامی سطح پر آفات کی تیاری اور فوری ردعمل یقینی بنایا جاسکے۔ شہری دفاع کے اداروں کو فعال کیا جائے، ابتدائی انتباہی نظام کو جدید بنایا جائے اور ماحولیاتی طور پر محفوظ انفراسٹرکچر کو ترجیح دی جائے۔ آبی گزرگاہوں پر قبضے کے فوری خاتمے اور دلدلی علاقوں کی بحالی جیسے اقدامات ان آفات کے تسلسل اور شدت کو کم کرنے کے لیے نہایت اہم ہیں۔

ایچ آر سی پی وفاقی اور صوبائی حکومتوں پر زور دیتا ہے کہ وہ اپنی آئینی ذمہ داریوں کو تسلیم کریں، سیاسی عزم اور دور اندیشی کا مظاہرہ کریں، اور فیصلہ کن وشمولیتی اقدامات کریں تاکہ پاکستان کو ہر سال بے دخلی اور تباہی کے تسلسل سے بچایا جاسکے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 10 ستمبر 2025]

ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن کا خیبر پختونخوا میں انسانی حقوق اور سکیورٹی کی صورتِ حال پر اظہارِ تشویش

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے زیر قیادت خیبر پختونخوا کے فیکٹ فائنڈنگ مشن نے ریاستی رٹ کے تیزی سے ختم ہوتے ہوئے اثر اور حکومت کی شہریوں کے حق زندگی اور آزادی کے تحفظ میں ناکامی، بالخصوص ضم شدہ اضلاع میں، پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔

یہ مشن ایچ آر سی پی کے چیئرپرسن اسد اقبال بٹ، شریک چیئرمنیزے جہانگیر، خزانچی اور سینئر صحافی حسین نقی، وائس چیئر اکبر خان، ماہرِ تعلیم اور ایچ آر سی پی کی رکن ڈاکٹر صبا گل خٹک، اور ایچ آر سی پی کے اسٹاف ممبران شاہد محمود اور سلمان فاروق پر مشتمل تھا۔ مشن نے 24 تا 26 ستمبر 2025 کے دوران سول سوسائٹی کے نمائندوں بشمول صحافیوں، وکلا، انسانی حقوق کے دفاع کاروں اور تنازع کے باعث بے گھر ہونے والے خاندانوں، سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور وزیرِ اعلیٰ سمیت خیبر پختونخوا حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں کیں۔

مقامی برادریوں اور فریقین نے بڑھتے ہوئے تشدد، بے دخلی اور سکیورٹی آپریشنز، اور مجوزہ خیبر پختونخوا مائنز اینڈ منرلز ایکٹ 2025 کے تحت قدرتی وسائل کے حصول کے درمیان ایک تشویش ناک تعلق کی نشاندہی کی ہے۔ ضم شدہ اضلاع کے کئی حصوں میں شدت پسند بظاہر بلا روک ٹوک سرگرم ہیں، جو مبینہ طور پر مقامی آبادی کو ہراساں اور بلیک میل کر رہے ہیں، انکار کرنے والوں کو قتل کر رہے ہیں اور شام کے بعد نقل وحرکت پر پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔ بعض اطلاعات کے مطابق، ان علاقوں میں قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی عملی طور پر غیر فعال ہو چکے ہیں۔

مشن کو خاص طور پر تیراہ میں حالیہ ہلاکتوں پر سخت تشویش ہے، جن میں اطلاعات کے مطابق فضائی بمباری کے نتیجے میں عورتوں اور بچوں سمیت 20 سے زائد عام شہری جاں بحق ہوئے۔ مشن نے ایک شفاف انکوائری کا مطالبہ کرتے ہوئے صوبائی اور وفاقی حکام پر زور دیا ہے کہ وہ ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے کے بجائے جواب دہی کو یقینی بنائیں۔ متاثرین کے لواحقین کو ناکافی معاوضہ دینا ریاستی جواب دہی اور قانون کے معین ضابطے کے تحت سلوک کا متبادل نہیں ہوسکتا۔

مشن اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ خیبر پختونخوا ایکشنز (ان ایڈ آف سول پاور) آرڈیننس 2019، جو ایک متنازع قانون ہے، تاحال نافذ ہے اور اس کے ذریعے حراستی مراکز اور امتناعی حراست کو قانونی جواز فراہم کیا جا رہا ہے۔ یہ آئین کے آرٹیکل 10 اور پاکستان کی بین الاقوامی قانونی ذمہ داریوں کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ اس کے علاوہ، عدالتی اور انتظامی نگرانی میں کمی اور کمزور ریگولیٹری نظام کے باعث جبری گمشدگیوں کا سلسلہ جاری ہے، جس کے ہزاروں واقعات کی شکایات موصول ہوئی ہیں، اگرچہ سرکاری اعداد وشمار کہیں کم ہیں۔

مشن نے وکلا، صحافیوں اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں، بالخصوص جبری گمشدگیوں کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کی ہراسانی کے واقعات بھی ریکارڈ کیے ہیں۔ یہ الزام کہ قانون نافذ کرنے والے اور سکیورٹی ادارے لوگوں کو جبری طور پر لاپتہ کرنے میں ملوث رہے ہیں اور بعد ازاں یہ افراد حراستی مراکز میں پائے گئے، نہایت سنگین ہے اور اس پر حکومت کا فوری ردعمل ضروری ہے۔

مشن نے قانونی برادری کی طرف سے تنازعات کے متبادل حل (اے ڈی آر) کے نظام کی بحالی پر شدید تحفظات بھی ریکارڈ کیے ہیں، کیونکہ اس طرح ایک متوازی عدالتی ڈھانچہ وجود میں آسکتا ہے، جو نہ صرف ناقابلِ اعتبار ہوگا بلکہ وہ قانون کی حکمرانی کو بھی کمزور کرے گا۔

مشن کے مطابق، ایسا تاثر ملتا ہے کہ 2018 میں بڑی جدوجہد کے بعد حاصل ہونے والا آئینی انضمام ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ نہ صرف سماجی اور معاشی ترقی کو پیچھے دھکیل دے گا بلکہ خاص طور پر خواتین اور متجنس (ٹرانس جینڈر) برادری جیسے کمزور طبقات کے حقوق کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوگا۔

[پریس ریلیز۔ پشاور۔ 28 ستمبر 2025]

2025ء کا سیلاب: پانی نہیں، نا اہلی اور کرپشن نے پاکستان کو ڈبو دیا

پانی بڑھتے ہی خاندان چھتوں پر چڑھ گئے جہاں وہ بچوں کو اپنے سینے میں جکڑے ہوئے تھے

پاکستان ایک بار پھر ڈوبا ہے اور اس مرتبہ نقصان پہلے سے زیادہ تباہ کن ہے۔ ایسا حیرت سے نہیں بلکہ دھوکا دہی سے ہوا ہے۔ 2025 کے سیلاب نے پنجاب کو تباہ کر دیا ہے، گھروں، فصلوں اور زندگیوں کو بہا لے گیا ہے۔ لاکھوں بے گھر ہیں۔ اربوں کا نقصان ہو چکا ہے۔ ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض سیلاب نہیں، نا اہلی کے نتیجے میں عوام کا قتل عام تھا۔

قدرت نے اپنا اثر یقیناً دکھایا ہے، مگر اصل تباہی دریاؤں میں طغیانی کی وجہ سے نہیں، بلکہ دفاتر میں افسران کی غفلت اور نالائقی کا نتیجہ ہے۔ فیڈرل فلڈ کمیشن اور محکمہ آبپاشی پنجاب جن پر ہمارا دفاع کرنے کی ذمہ داری تھی، انہوں نے ہی ہمارے خاتمے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے گرتے ہوئے پشتے اور نظر انداز کیے گئے دفاع نے قدرتی سیلاب کو انسانوں کے قتل عام میں بدل دیا۔ یہ بارش کا المیہ نہیں، نا اہلی اور کرپشن کا مہلک امتزاج ہے۔

انتباہات کبھی پوشیدہ نہیں تھے۔ 2010ء کے سیلاب کے بعد، اس وقت لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس سید منصور علی شاہ نے احسن طریقے سے رپورٹ [A rude awakening] مرتب کی جس میں مجرمان کے نام بتائے گئے۔ اس نے نظامی غفلت، ناقص دیکھ بھال، اور افسر شاہی کی بے حسی سے خبردار کیا۔ پھر بھی کسی نے استعفیٰ نہیں دیا۔ کسی کو سزا نہیں دی گئی۔ کوئی اصلاحات نہیں کی گئیں۔ اور یوں، 15 سال بعد، تاریخ اس سے بھی بڑے ظلم کے ساتھ لوٹی۔ کنارے ریت کے قلعوں کی طرح گر گئے، بیراجوں نے راستہ دیا، اور پورے گاؤں لہروں میں غائب ہو گئے۔

سیلاب کے تخفیف کے ڈھانچے کو لائف لائن سمجھا جاتا ہے۔ لیویز، ڈیم، فلڈ وال، ڈائیورژن چینلز، یہ آسائشیں نہیں ہیں بلکہ یہ محافظ ہیں۔ ان کا مشن آسان ہے کہ پانی روکیں، جانیں بچائیں، گھروں کی حفاظت کریں۔ تہذیبوں نے اسے صدیوں سے جانا ہے۔ قدیم میسوپوٹیمیا کے لوگوں نے مٹی کی پٹیاں بنائی تھیں جبکہ وادی سندھ کی انجینئرڈ نہریں۔ لیکن آج کے پاکستان میں ان سرپرستوں کو موت کے جال میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس سال جب ندیاں بلند ہوئیں تو وہ ریت کی طرح بکھر گئے۔

لیکن یہ کیوں ہوا؟ کیونکہ یہ پشتے کبھی قائم رہنے کے لیے بنائے ہی نہیں گئے تھے۔ بین الاقوامی معیارات ٹھوس



ندیاں موت کا جال بن چکی ہیں



چند افراد کی غفلت سے پورے گاؤں تباہ ہو گئے

کوروں کے ساتھ ساتھ یہ ریتلی مٹی کی مٹی کے پشتے، سیپج کنٹرول، ڈھلوان سے تحفظ اور مسلسل نگرانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہمارے مٹی کے یہ ڈھیر سستے مواد، کمزور کور، صفر نکاسی اور مجرمانہ غفلت کے ساتھ بنایا گئے تھے۔ کٹاؤ انہیں سال بہ سال کھا گیا۔ سیپج نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ دباؤ میں ڈھلوانیں گر گئیں۔ دیکھ بھال ایک سراب تھا جن کے نام پر بجٹ لوٹ لیا گیا۔ 2025ء کے سیلاب نے کسی کو بھی حیران نہیں کیا کیونکہ یہ ناکامی حادثاتی نہیں تھی، یہ ناگزیر تھی۔

یہ ناکامی اس دہائی سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس کی جڑیں صدیوں پر پرانی ہیں۔ برطانوی راج کے تحت سیلاب کا انتظام مقامی برادریوں سے چھین کر نوآبادیاتی ہائیڈرولوجی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ 1841ء اور 1858ء کے سندھ کے عظیم سیلابوں کا سامنا انجینئرنگ کے جنون سے ہوا جن میں بڑے پیمانے پر پشتے، نہریں اور بیراج نمایاں تھے۔ پانی کی کٹائی اور سیلاب کے میدانی انتظام کے روایتی نظام کو ضائع کر دیا گیا۔

فطرت پنجرے میں بند تھی۔ سیلاب کو قدرتی آفات کے طور پر دوبارہ بیان کیا گیا جسے صرف ٹیکنالوجی ہی 'ٹھیک' کر سکتی ہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کو یہ میراث ملی جسے ہم نے اپنی بدترین عادات سے مکمل کیا۔ ہم نے دیواریں بنائیں لیکن ان کی دیکھ بھال نہیں کی۔ ہم نے رپورٹس تیار کیں لیکن ان پر کبھی عمل نہیں کیا۔ جو کبھی نوآبادیاتی تجربہ تھا وہ اب قومی

لعنت بن چکا ہے۔

دریاؤں نے ہمیں بار بار خبردار کیا ہے۔ چناب کا سیلاب 1992ء میں 9 لاکھ 48 ہزار 530 کیوسک، 1988ء میں راوی کا 5 لاکھ 76 ہزار کیوسک اور 1955ء میں ستلج کا 5 لاکھ 97 ہزار کیوسک تھا۔

ہر سیلاب ایک گرج دار یاد دہانی تھا۔ لیکن ہم سو گئے۔ رپورٹیں محفوظ کر دی گئیں، فائلیں دفن کر دی گئیں اور وارننگز کو مسترد کر دیا گیا۔ پھر 2010 آیا، ایک اور تباہی۔۔۔ پھر 2022، ایک اور آفت۔۔۔ اب 2025، ایک اور قتل عام۔۔۔ آخر ندیوں کو کتنی بار گرجنا چاہیے کہ ہمارے کانوں تک ان کی آواز پہنچ سکے؟

اس سال کا سیلاب apocalyptic (تباہ کُن) تھا۔ پشتے کھلونوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ بیراج دباؤ میں کراہتے رہے اور ناکام ہو گئے۔ دریاؤں کا ذخیرہ شدہ قہر کھیتوں اور شہروں پر چھوڑ دیا گیا۔ پنجاب حکومت نے حیران کن تعداد کا اعتراف کیا کہ 20 لاکھ افراد متاثر، پورے گاؤں مٹ گئے، گھر اور سڑکیں ڈوب گئیں، فصلیں تباہ، کھیت تباہ، اربوں کی املاک اور زراعت کا نقصان ہوا۔

پانی بڑھتے ہی خاندان چھتوں پر چڑھ گئے جہاں وہ بچوں کو اپنے سینے میں جکڑے ہوئے تھے۔ کسانوں نے اپنی سال بھر کی فصل کو منٹوں میں ختم ہوتے دیکھا۔ غریبوں نے اپنی ملکیت کی واحد دیواروں کو مٹی میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ یہ محض فطرت کا غصہ نہیں تھا بلکہ یہ غداری کی فصل تھی۔

اور پھر بھی، ہم ہر بار ایک ہی عذر سنتے ہیں کہ آب و ہوا کی تبدیلی (climate change) کو موردِ الزام ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ ہاں، بارشیں زیادہ ہوتی ہیں، موسم زیادہ بے ترتیب ہونے سے سیلاب زیادہ آتے ہیں لیکن ہمیں دھوکا نہ دیں۔ موسمیاتی تبدیلی چنگاری ہے، دھماکا نہیں۔ مضبوط دفاع مزاحمت کرتا ہے تو کمزور دفاعی نظام ٹوٹ جاتا ہے اور پاکستان کے دفاع کو جان بوجھ کر کمزور چھوڑا گیا۔ فنڈز چھین لیے گئے، وارننگز کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس پانی نے صرف دیواریں ہی نہیں توڑیں بلکہ کئی دہائیوں کے جھوٹ کو بے نقاب کیا ہے۔

بار بار ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیونکہ پاکستان میں احتساب ہمیشہ مظلوموں سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ ہر سیلاب کے بعد ایک کمیشن بنتا ہے، رپورٹ لکھی جاتی ہے، سرخیاں چند دن چیخیں مارتی ہیں اور پھر خاموشی ہوتی ہے۔ مجرم مراعات کے ساتھ ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ سائیکل ری سیٹ ہو جاتا ہے۔ اور پھر یونہی ہر سال عوام خون سے ادائیگی کرتے ہیں۔

جسٹس منصور علی شاہ کی 2010ء کی رپورٹ میں جن مجرمان کا نام لیا گیا تھا، 2025ء میں وہی مجرم انچارج ہیں،



جنہوں نے اپنا گھر اور خاندان کھویا ہے انہیں زندگی کی طرف لوٹنے میں بہت وقت درکار ہوگا



سیلاب سے پنجاب میں اربوں روپے کی فصلوں کو نقصان پہنچا ہے

وہی پشتے ٹوٹتے ہیں، وہی بہانے بنائے جاتے ہیں۔ یہ مجرمانہ غفلت نہیں تو کیا ہے؟

2025 کا سیلاب نہ صرف اس کے پانی کے لیے، بلکہ اس کی دھوکہ دہی کے لیے بھی یاد رکھا جائے گا۔ پہلے ہی قرضوں میں ڈوبا ہوا ملک اب مزید اربوں کا نقصان اٹھا چکا ہے۔ قوم کا پیٹ پالنے والے کسان اب دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ جن خاندانوں کے پاس پہلے ہی بہت کم تھا اب کچھ بھی نہیں ہے۔ لاکھوں بے گھر ہو چکے ہیں اور ان کے حالات جلد معمول پر نہیں لوٹ سکتے۔

انفرااسٹرکچر کی تعمیرِ نو میں برسوں لگیں گے۔ اور پھر بھی، جو ادارے قومی ناکامی کا سبب ہیں وہ احتساب سے ماورا ہیں۔ فیڈرل فلڈ کمیشن اب بھی محض رپورٹس لکھتا ہے۔ محکمہ آبپاشی پنجاب اب بھی بجٹ پر دستخط کرتا ہے۔ وہی لوگ جنہوں نے کمزور پشتوں پر دستخط کیے تھے وہ اب بھی تنخواہ لیتے ہیں۔ یہ گورننس نہیں ہے۔ یہ خیانت ہے۔

پاکستان ہر دہائی میں سیلاب کا ماتم کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا گویا یہ مقدر بن گیا ہے۔ انہیں روکا جا سکتا ہے۔ اگر اداروں میں اصلاحات کی جائیں، اگر احتساب کا نفاذ ہو، اگر سیلاب کا انتظام بیان بازی سے لچک کی طرف بدل جائے۔ پشتوں کو سائنس سے دوبارہ بنایا جاسکتا ہے، شارٹ کٹ سے نہیں۔

بجٹ شفاف ہوسکتا ہے۔ رپورٹس پبلک ہوسکتی ہیں۔ اور ناکامیوں کو سزا ملنی چاہیے، ترقی نہیں۔ ناکارہ ڈھانچے پر دستخط کرنے والے انجینئرز کا نام ہونا ضروری ہے۔ وارننگز کو نظر انداز کرنے والے بیوروکریٹس کو ہٹایا جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا پاکستان پانی اور خاموشی میں ڈوبتا رہے گا۔

2025ء کا المیہ صرف پانی ہی نہیں جس نے دیہات کو ڈبو دیا بلکہ اس کے بعد ہی خاموشی ہے۔ ایک خاموشی جو کہتی ہے، 'یہ عام بات ہے'۔ ایک خاموشی جو اداروں کو فرار ہونے دیتی ہے۔ ایک خاموشی جو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ ہم 2030ء یا 2035ء میں دوبارہ ڈوب جائیں گے۔

پاکستان کو دھوکا دیا گیا ہے۔ دریاؤں سے نہیں، وہ ہمیشہ سیلاب لاتے ہی ہیں۔ بارشوں سے نہیں وہ تو برستی ہی ہیں۔ دھوکا اپنے اپنے اداروں کی طرف سے ملا ہے۔ پاکستان کو اس کے اپنے انجینئرز کے ذریعے لوٹا گیا ہے۔ اپنے ہی بیوروکریٹس کے ہاتھوں نقصان ہوا ہے۔ سیلاب نہیں مارتا، کرپشن مار دیتی ہے، غفلت مار دیتی ہے، خیانت مار دیتی ہے۔

2025 میں، 20 لاکھ پاکستانیوں نے اس سچائی کو مشکل ترین طریقے سے سیکھا۔ اور جب تک ہم تبدیلی کا مطالبہ نہیں کرتے تب تک ہم احتساب پر مجبور نہیں ہوتے، جب تک ہم ایمانداری کے ساتھ دوبارہ تعمیر نہیں کرتے، اگلا سیلاب اسے پھر سے سکھائے گا۔ پھر دوبارہ اور دوبارہ۔۔۔ جب تک پاکستان نہ صرف پانی بلکہ تاریخ کی توہین میں ڈوب جائے گا۔

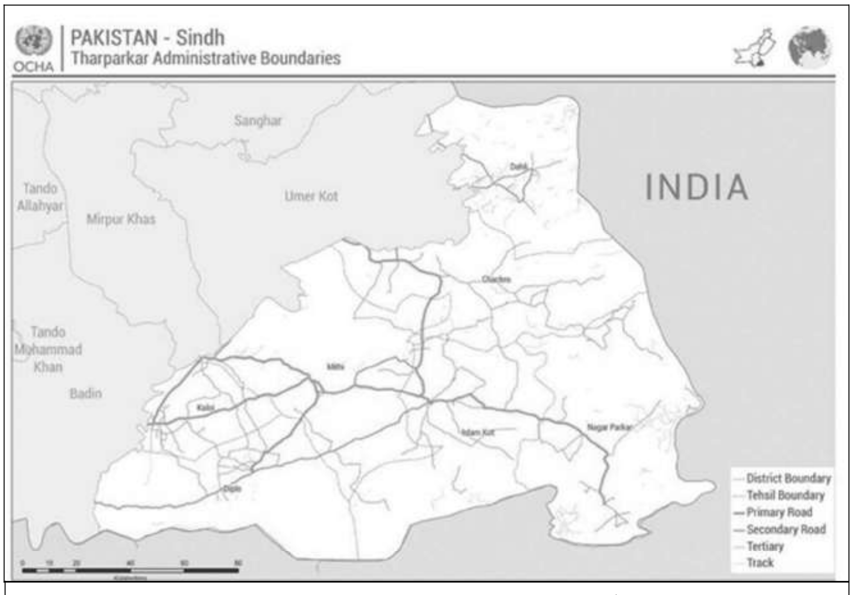
تھر میں جدیدیت: کوئلے اور دودھ کی سرزمین پر ترقی کا بوجھ

ماہم مہر

سال 1925 میں چھاچھرو کے پڑوسی علاقوں جیسلمیر اور جودھ پور کے "بدمعاشوں" کے ہاتھوں تسلسل سے مادہ اونٹنیاں چرانے کے واقعات ضلعی مجسٹریٹ تھر پارکر، کمشنر سندھ اور مغربی راجپوتانہ ریاستوں کے ریزیڈنٹ کے درمیان خط وکتابت کے سلسلے کا باعث بنے۔ تھر واسیوں کو ریت میں قدموں کے نشانات پہچاننے میں ماہر افراد کے ذریعے علم ہوا کہ چوری ہونے والی اونٹنیاں ریاستی سرحد کے اُس پار واقع ایک گاؤں میں لے جائی گئی ہیں جنہیں واپس لانے کے لیے انہیں 180 روپے بھنگ یا رشوت کے طور پر دینا پڑے۔ چونکہ 1903 کے بھارتی حوالگی کے قانون کے تحت اونٹ کی چوری ایک قابل گرفتاری جرم نہیں تھی اس لیے پولیس ایسا کرنے والوں کو گرفتار کر کے سزا کے لیے نہیں لاسکتی تھی۔ خط وکتابت میں حوالگی قانون میں ترمیم کو خارج ازامکان قرار دیتے ہوئے غور کیا گیا کہ پھر اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے کیا "بارڈر بدمعاش کانفرنس" بلائی جائے؟

ٹھیک 100 سال بعد بھی تھر کے باسی اونٹ چوری ہونے کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اب ایک سماجی فرق پیدا ہو چکا ہے. اب وہ صحرا میں سراغ رسانی نہیں کر سکتے کیونکہ اب 21ویں صدی میں سڑکوں کی تعمیر نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے اور قدموں کے نشان کی تلاش ممکن نہیں رہی۔

ان رپورٹس اور دیگر شکایات پر ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے لیے ایک رپورٹ تیار کرنے کے لیے میں نے حال ہی میں تھر پارکر کا دورہ کیا، کمیشن نے پہلی بار اس ضلع کے 4 بڑے قصبوں میں اپنے کیمپ قائم کیے جس کے لیے مختلف علاقوں سے لوگوں کو بلایا گیا تھا تا کہ وہ ان زیادتیوں اور مسائل کے ممکنہ حل پر بات کر سکیں جن کا وہ سامنا کرتے ہیں۔ مجھے کراچی سے ٹیم کے ہمراہ اسلام کوٹ تک سفر کرنا تھا جہاں ایک رات قیام کے بعد نگر میں لگائے جانے والے کیمپ میں شرکت کرنا تھی۔ یہ سفر اگلے روز مٹھی میں سول سوسائٹی کے نمائندوں سے ملاقات کے بعد مکمل ہونا تھا۔ میری ذمہ داری تمام موصول معلومات کو 3 ہزار الفاظ میں قلمبند کرنا تھا، بمشکل ایک ہفتے میں کیے جانے والے اس کام کو مکمل کرنے میں مجھے 3 ماہ کا عرصہ لگا۔ اور ایسا کیوں ہوا، یہ سمجھنے کے لیے مجھے آپ کو اسلام کوٹ میں گزری پہلی رات تک لے جانا پڑے گا۔



اقوام متحدہ کے دفتر برائے رابطہ انسانی امور (یواین او سی ایچ اے) کا ایک نقشہ، 2023 کے آس پاس تھر میں سڑکوں کا جال دکھا رہا ہے

چوری کا انوکھا قصہ

اس سفر میں میرے ساتھ سماجی نظریات رکھنے والے تھری "ایس صاحب" تھے جن کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میری پہلی نظر نے ہی انہیں پسندیدگی کی سند بخشی کیونکہ وہ اس سرزمین کو جاننے والے اور وقت کے ساتھ چلنے والے شخص لگ رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ یہ بات سمجھتے تھے کہ میں ایک اجنبی ہوں جسے تھر کو سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔ میں پہلے ہی اس بات سے خوفزدہ تھی کہ چند انٹرویو کر کے، اُنہیں چمکدار لفظوں میں لپیٹ کر ایک فیچر کی صورت میں پیش کرنے سے اخلاقی صحافت کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

میں نے ایس صاحب کے سامنے اپنی ایک تشویش کا اظہار کیا کہ تھر پارکر کے بارے میں لکھنا، پڑھنے والے پر اُکتا جانے والا اثر ڈالنے کا خطرہ رکھتا ہے۔ ایک بیہوشی طاری ہو جانے کا خدشہ ہوتا ہے، تاہم کسی معجزے سے اگر وہ دوسرے پیراگراف تک اپنے ہوش وحواس میں رہیں تب بھی پانی اور کوئلے جیسے دو ناگزیر موضوعات سامنے آتے ہی غنودگی طاری ہونا طے ہے۔ آپ کو ہمیشہ یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ تھر میں پانی کبھی کافی نہیں ہوتا لیکن کوئلے کی مقدار مضحکہ خیز حد تک زیادہ ہے۔

خوش قسمتی سے ایس صاحب نے میری اس الجھن کو سمجھتے ہوئے میرے لیے ایک غیر رسمی مشاورتی نشست کا انتظام کیا جس میں ان کے صحافی، ڈاکٹر، سماجی کارکن، ہنرمند اور بابو دوست شامل تھے۔ یوں اسلام کوٹ میں اپنی پہلی ہی شام ہم بازار میں واقع ایک ہندو تاجر کے دفتر میں رات کا کھانا کھانے کے لیے روانہ ہوئے۔

ایس صاحب کے دوستوں کے حلقے نے میرے بچگانہ سوالات کو برداشت کیا۔ مگر جیسے جیسے شام گہری ہوتی جاتی اور میرے قلم کی سیاہی ختم ہونے لگی، دل میں وہی خدشہ جاگ اٹھا کہ یہ سب کچھ میں پہلے بھی سن چکی ہوں: شہری زندگی کی بنیادی سہولیات ناپید ہیں، مگر حکومتی بے حسی بھرپور موجود ہے۔ تھر میں نہ بارش ہے، نہ کالج، نہ اسپتال، اور نہ ہی عدم برداشت۔۔۔ لیکن بہرے ریونیو افسران، زمینوں پر قابض مافیا اور سادگی ہے۔ حالات مزید خراب بنانے والی بات یہ ہے کہ یہ تمام معلومات ایک کہانی کی شکل میں سمیٹنے کی میری سکت خون میں گلوکوز کی سطح کم ہو جانے (ہائپوگلیسیمیا) سے جواب دے چکی ہے۔ کھانے کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔

اچانک ہماری میزبانی کرنے والے تاجر صاحب نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے ایس صاحب سے کہا،'' کیا ہوا، کچھ پینے کا ارادہ نہیں؟'' اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ شاید میری موجودگی نے اس کچہری کی روانی پر ہلکا سا بریک لگا دیا تھا۔

ایس صاحب نے بغیر کوئی جواب دیے اخلاقی سہارے کے لیے کمرے میں نظریں دوڑائیں، مگر ان کے دوست موقعے کی نزاکت دیکھ کر یا تو موبائل فون میں گم ہو گئے یا دانتوں سے ناخن چبا کر اپنا مینی کیور چیک کرنے لگے۔

صورتحال دیکھتے ہوئے میں بولی، "چلیں، میں ایک لے لیتی ہوں۔"

اپنی میز کی دراز سے نکالے گئے "آپشنز" پیش کرنے والے ہمارے میزبان وہیں منجمد ہو گئے، سب کی نظریں جھٹ سے میری جانب مڑیں۔

میں نے کرسی سے ٹیک لگا کر اپنی گردن ترچھی کر لی۔

تاجر صاحب ہنس پڑے اور آنکھوں میں چمک لیے ایس صاحب سے بولے، " کیا ارادہ ہے؟"، پھر جواب کا انتظار

کیے بغیر ہی ٹویو کا نازک سا گلاس میز پر رکھتے ہوئے برف لانے کے لیے آواز لگائی۔

راحت بھری ہنسی نے کمرے کی برف پگھلا دی۔ میرا داؤ کامیاب رہا۔ وہ سب یوں محسوس کرنے لگے جیسے میں بھی انہی میں سے ہوں اور وہ میرے سامنے بلا جھجک بات کر سکتے ہیں۔

یہ لمحہ میرے اسائنمنٹ کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ آپ پڑھیں گے، وہ میرے تھر میں گزارے گئے 3 دنوں میں سُنی ہوئی باتوں کا خلاصہ ہے۔ ان میں وہ مشاہدات بھی شامل ہیں جنھیں بطور ایک خاتون رپورٹر سننے کا اعزاز مجھے اسلام کوٹ میں سندھی اور ڈھاتکی بولنے والے میگھواڑ، لوہانا، شرما اور کمار حضرات کی محفل میں حاصل ہوا۔ ان میں سے بیشتر باتوں کی تصدیق اگلے دن کیمپ میں گاؤں اور قصبے کے لوگوں اور اس کے بعد مٹھی میں ہونے والی مشاورت میں بھی کی گئی۔ دورے کے اختتام تک مجھے لگنے لگا کہ شاید ایک ہی بیماری ان سب کی کہی باتوں کو بیان کر سکتی ہے: سرمایہ داری سے تھر کے پُرتشدد تصادم کا زخم۔

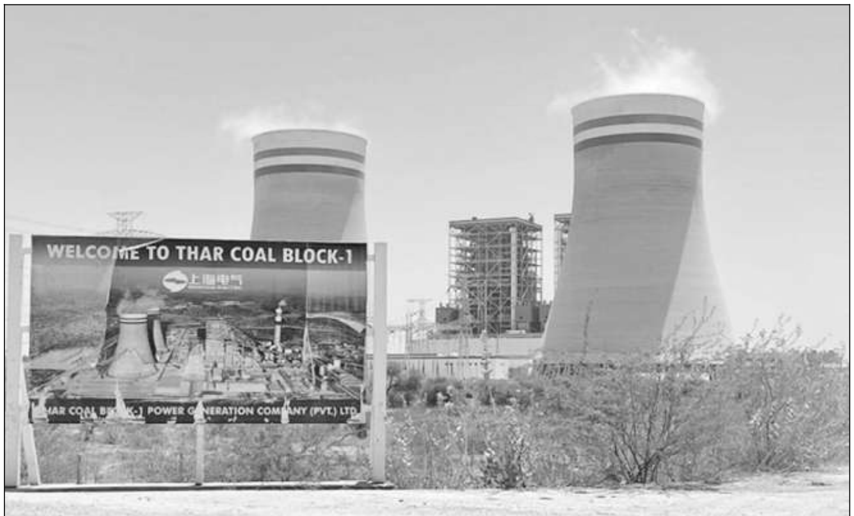
اب میں یہ مقدمہ پیش کرتی ہوں۔

سڑک

تھر واسی فطرت کے منظورِ نظر نہیں ہیں۔ فطرت ان کے خلاف زمین کی گہرائیوں سے خاموش جنگ لڑتی ہے۔ انہیں سیاہ سونا حیران کن حد تک اس فراوانی سے عطا کرتی ہے کہ ان کے خلاف کارپوریٹ لالچ، بے دخلی اور ماحولیاتی بربادی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ اور اُفق سے برستی بارش کے معاملے میں ایسی کنجوسی دکھاتی ہے کہ ہر دو تین برس بعد انہیں قحط سے لڑنا پڑے۔۔

قحط اور کوئلہ – سابق صدر پرویز مشرف کے لیے دو ہزار کی دہائی میں یہ 2 الفاظ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی تھے کہ یہ صحرا اب کاروباری نقشے پر ہونا چاہیے۔ یوں سرخ قالین بچھا دیا گیا، قصبوں کو جوڑنے کے لیے سڑکوں کا ایک ایسا جال بُنا گیا جو اس سے قبل کبھی نہ دیکھا گیا تھا۔ "سڑک" اب تھر واسیوں کے لیے ایک استعارہ بن گئی ہے، "جب سڑک بنی" بالکل ویسے ہی کہا جاتا ہے جیسے کہ نصابی کتب میں سندھ کی تاریخ کا نقطۂ آغاز محمد بن قاسم کی آمد سے جوڑا جاتا ہے۔

سڑک نے باہر کے لوگوں، تاجروں، مڈل مین اور مفاد پرستوں کے لیے ایک ایسی سرزمین میں داخل ہونا ممکن بنا دیا جو صدیوں تک دنیا سے کٹی رہی تھی۔ یہاں تک کہ تھر واسی شکایت کرنے لگے کہ وہ بازار میں دکھائی دینے والے بہت سے چہرے پہچان ہی نہیں پاتے۔ چوری اور ڈکیتی کے واقعات بڑھ گئے، اور ساتھ ہی عدم تحفظ کے ایسے احساس نے جنم لیا جس کا تجربہ یہاں پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ (جاننے کے لیے عارف حسن کی کتاب "تھر پارکر: قحط، ترقی اور سماجی



یہ تصویر تھر کول پاور پلانٹ بلاک 1 کی ہے۔ 12 بلاکس میں سے صرف دو ہی کام کر رہے ہیں



مٹھی کے باہر ایک چھوٹا مندر

تبدیلی" پڑھیں۔)

سڑک کی بدولت تھر پاکستان بھر میں متعارف ہوا اور یہاں قحط کے نتیجے میں نئے میڈیا کی توجہ انتقال کر جانے والے بچوں پر گئی۔ ردِعمل میں حکومت اور دیگر نے حل کے طور پر غذائیت کے پروگرام کا آغاز اور نقد رقوم دیے جانے کا فیصلہ کیا۔ آج بھی انکم سپورٹ پروگرام کے تحت حاملہ خواتین، نئی ماؤں اور بچوں کو تقریباً 3 ہزار روپے ہر ماہ دیے جاتے ہیں۔ کچہری میں موجود ایک سرکاری ڈاکٹر کا خیال تھا کہ ان اقدامات نے تھری معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق، "ایک خاتون یہ رقم لیتی ہے تو دوسری خواتین کو بھی بتاتی ہے''، ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ ایک حاملہ عورت کے پیشاب کے نمونے سے تین غیر حاملہ عورتوں کو یہ رقم وصول کرنے کے قابل بناتے ہیں، مزید کہا کہ، "یہ سچ ہے، میں جھوٹ کیوں بولوں؟" (میں ان کے دعوؤں کی آزادانہ تصدیق نہیں کر سکی۔)

ڈاکٹر نے مزید کہا کہ، "نام نہاد' جعلی' حمل کی تفتیش کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے گھروں کو 3 ہزار روپے ماہانہ کیا ہی فائدہ دیں گے۔ ڈاکٹر کا اگلا دعویٰ مزید پریشان کن ہے کہ خواتین رقم لینے کے لیے زیادہ بچے پیدا کر رہی ہیں۔ انہوں نے طنزاً کہا کہ، "وہ خاندانی منصوبہ بندی کی بات کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی لوگوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کے لیے رقم بھی دے رہے ہیں۔" فلاحی رقوم اور شرح پیدائش کے درمیان تعلق کا یہ خیال کمزور ہے لیکن اس سے میرا شک مزید پختہ ہو گیا کہ سرکاری اور غیر سرکاری فیصلے یہاں فائدہ دینے کے بجائے اُلٹا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

شناخت کی چوری

یہ جاننے کے بعد کہ تھر کا نام کس طرح وجود میں آیا، میرا یقین پختہ ہو گیا کہ تھر میں ہمیشہ سے ہی نظامی نوعیت کا تشدد کرنا آسان رہا ہے۔ 'تھرپارکر' نام کی کوئی چیز نہیں تھی جب

تک کہ انیسویں صدی میں برطانوی حکومت نے ایک ضلع تشکیل دینے کے لیے تھر اور پارکر کو جوڑ کر یہ نام رکھا۔ یہ خطہ "ڈھٹ' کہلاتا تھا اور راجپوتانہ (راجستھان کے صحرا) کی بڑی ریاستوں کا حصہ تھا۔ پارکر کچھ کا ایک بالکل ہی الگ علاقہ تھا۔

یہ قصہ چھاچھرو میں کُھلا جہاں ایس صاحب نے اپنی مخصوص بڑوں والی نرمی اور ضد کے ساتھ مجھے میرے اصل اسائنمنٹ والے مقام نگر کے بجائے یہاں آنے پر آمادہ کرلیا۔ان کا کہنا تھا کہ چھاچھرو کوئی نہیں آتا۔اس تعلقہ کے تنہا ہونے کا احساس پریس کلب کے دروازے پر جاتے ہی ہوگیا جہاں ایکٹوسٹ علی اکبر راحمو اور گوتم راٹھی نے حیرت کے ساتھ میرا استقبال کیا۔علی اکبر کا کہنا تھا کہ، "ہم سوچ رہے تھے کہ ایچ آر سی پی نے آخر یہاں کیمپ لگانے کا فیصلہ کیسے کرلیا، چھاچھرو تو کوئی کبھی آتا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جب اُس نے اس کیمپ میں شرکت کی دعوت دی تو لوگ الجھن میں پڑ گئے۔ کئی تو یہ سمجھے کہ شاید یہ کوئی میڈیکل کیمپ ہے جہاں آنکھوں کا معائنہ کیا جائے گا۔"

سیشن کے آغاز سے قبل، گوتم راٹھی اور علی اکبر نے یہ محسوس کیا کہ مجھے چھاچھرو کی تاریخ کے خدوخال کا علم ہونا چاہیے جو اسے تھر سے الگ پہچان دیتے ہیں، اور مجھے موجودہ مسائل کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

انہوں نے بتایا کہ برطانوی دور سے پہلے تک یہ ساری زمین اجتماعی ملکیت تھی اور لوگوں کی رہائش پانی کے قریب (کنوؤں اور ترائی یعنی قدرتی تالابوں کے پاس) تھی۔تھر کے لوگ مویشی پالتے اور جو چیزیں وہ اُگا سکتے تھے یا آپس میں تبدیل کرسکتے تھے (دودھ، گھی، اون، چمڑا) اسی سے گزربسر کرتے تھے۔ برطانوی راج میں ملکہ کی تصویر والے ''رانی چھاپ'' سکے، ایک پولیس فورس اور ریونیو سسٹم متعارف کروایا گیا اور 1930 تک لوگوں کو سرکاری زمین دی جانے لگی تاہم چراہ گاہوں کو نہیں چھیڑا گیا تاکہ سب کے جانور آزادانہ چر سکیں۔

برطانوی یہاں تقریباً 100 سال تک رہے۔ انہوں نے ڈسپنسریاں اور اسکول قائم کیے جس سے انہیں تھر کے لوگوں میں مقبولیت حاصل ہوئی، کیونکہ مسلم تالپور، کلہوڑا اور راجپوتانہ کے حکمرانوں کے دور میں لوگوں نے ایسا طرز حکومت نہیں دیکھا تھا۔

آج بھی فقرہ ''جی بھوراتینا'' (یعنی تم نے وہ کام کیا جو گورے کرتے تھے) یہ کہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ایسا کوئی اور نہیں کرسکتا۔ جب 1947 میں تقسیم کے وقت برطانوی یہاں سے جانے لگے تو لوگ اس بات کا یقین ہی نہیں کر پا رہے تھے، اوپر سے ہجرت کی افراتفری نے مزید



بائیں: علی اکبر رحمو، گوتم راٹھی اور قمرالدین رحمو چھاچھرو پریس کلب میں۔ان کے پیچھے چھاچھرو اور ڈاہلی کے لوگ ہیں جو 15 اپریل 2025 کو ایچ آر سی پی کیمپ میں اپنی شکایات بتانے آئے تھے؛ دائیں: گوتم راٹھی صاحب مجھے اجرک پیش کر رہے ہیں۔تھر کی تاریخ اور روایات کے وسیع علم کی وجہ سے انہیں تھر کا انسائیکلوپیڈیا مانا جاتا ہے

بے یقینی پیدا کردی تھی۔

تھری تاریخ کی تشکیل میں دوسرا بڑا عنصر 1965 میں بھارت کے ساتھ ہونے والی جنگ تھی، جب یہ علاقہ راجستھان سے الگ ہوگیا۔تھری ہندوؤں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا کیونکہ بھارت میں ان کے قریبی عزیز تھے، اور اس بات نے حکومت کو نگرانی بڑھانے کا جواز فراہم کیا۔ 1971 تک یہ بداعتمادی مزید بڑھ گئی جب بھارت نے عارضی طور پر چھاچھرو پر قبضہ کیا اور اسے نقصان پہنچایا۔صرف 2 سال بعد شملہ معاہدے کے تحت یہ ضلع پاکستان کو واپس مل گیا۔ چھاچھرو کی تعمیر نو میں کافی وقت لگا اور کافی عرصے تک یہ "کنوارے مردوں کا شہر" کہلاتا رہا کیونکہ یہ اس لحاظ سے مناسب نہیں تھا کہ خاندان وہاں رہائش پزیر ہوسکیں۔

یہ تاریخی پہلو واضح کرتا ہے کہ چھاچھرو کو 2001 تک مکمل طور پر بند کیوں رکھا گیا، تاکہ یہ بھارت کے ساتھ ایک بفرزون کا کردار ادا کرے۔کیمپ میں موجود ایک شخص نے کہا کہ، "1971 کی جنگ کے بعد سے ریاست پاکستان نے تھرپارکر کے لوگوں کو کبھی باقاعدہ شہری نہیں سمجھا، ہم یہاں نوآبادیاتی دور کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔" یہاں کوئی سڑک نہیں تھی، نہ ٹی وی، نہ سیاح اور نہ ریڈیو۔ وہاں کے رہائشیوں کا کہنا تھا کہ جب دوہزار کی دہائی میں سڑک بنی تو سب کچھ بدل گیا۔

غلط پتا

قصبے کی مرکزی سڑک پر واقع چھاچھرو پریس کلب ایک ایسی جگہ ہے جہاں کمپیوٹر ہے نہ فرنیچر۔ ایچ آر سی پی کے منتظمین نے فیصلہ کیا کہ لوگوں کو اندر بٹھایا جائے اور سیاہ رنگ کا فریج کے سائز جتنا اسپیکر ڈرائیو وے میں رکھ دیا جائے۔ مارکیٹنگ کی چال چلتے ہوئے علی اکبر رحمو نے ایچ آر سی پی کے رضا کاروں سے کہا کہ بوم باکس کا رخ سڑک کی جانب کردیں تاکہ قصبے میں اس دن اپنے کاموں میں مصروف ہر شخص سُن سکے کہ کس طرح دو درجن سے زائد مرد تاردوس سے لے کر کھنسر گاؤں تک کے حالات پر بات کر رہے تھے۔ ایچ آر سی پی کو سوشل میڈیا کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہ آئی، اس نے 5 گھنٹے تک جاری رہنے والی خالصتاً براہِ راست آڈیو سے پورے قصبے کو اپنی آواز پہنچادی۔

کچھ مرد مائیک پر بولتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اسٹینڈ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو ہاتھوں میں فائلیں پکڑے جھجک رہے تھے اور مائیک سے اس طرح فاصلے پر کھڑے تھے جیسے کہ یہ کوئی ایسی انوکھی شے ہو جو اُن کی آواز چُرا لے گی۔ یہ تمام افراد چھاچھرو اور نئی تحصیل ڈاہلی سے آئے تھے، ان دونوں جگہوں پر تھر کی آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ رہتا ہے۔ مگر اپنے رقبے اور آبادی کے باوجود دونوں اضلاع میں سرکاری موجودگی اس قدر کم ہے کہ کسی بھی سرکاری کام کے لیے 2 گھنٹے کا سفر طے کرکے مٹھی جانا پڑتا ہے۔ ڈاہلی میں تو اب تک پریس کلب بھی نہیں ہے، اسی لیے اس کے بارے میں شاذونادر ہی کچھ سننے کو ملتا ہے۔

آپ کو لگ رہا ہوگا کہ مقررین کی ترجیحات میں سے پہلے پانی کی کمی کا ذکر ہوگا، لیکن حقیقت اس کے برعکس رہی۔ تھر کے قدرتی وسائل میں سے ایک جو بظاہر وافر مقدار میں موجود ہے، انسانی حقوق کی پامالیوں کی اصل جڑ کے طور پر سامنے آیا اور وہ ہے زمین۔گل شیر، باوقار انداز رکھنے والا ایک نوجوان، جس کا خاندان نو پشتوں یعنی 300 برس سے

کھوکھراپار میں آباد ہے، یہ خبر لے کر آیا کہ سرحد کے قریب تقریباً 800 مربع کلومیٹر زمین نجی کمپنیوں کے ہاتھ بیچ دی گئی ہے۔ اس نے کہا کہ، " قانون کی نظر میں یہ زمین ہماری ہے ہی نہیں۔ ہمارے پاس کوئی ملکیتی کاغذات نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں جو یہ ثابت کرے کہ ہم صدیوں سے یہاں موجود ہیں۔"

میں یہ توقع کر رہی تھی کہ ایچ آر سی پی کے اس کیمپ میں لوگ انسانی حقوق کی عام خلاف ورزیوں جیسے کہ جبری گمشدگیوں اور مذہبی امتیاز پر بات کریں گے کیونکہ پاکستان میں ہم ایسی ہی باتیں سننے کے عادی ہیں اور یہ کسی نہ کسی حد تک یقینی طور پر موجود بھی ہیں، لیکن یہاں سنگین اجتماعی تشدد مسلط ہے اور ایسا نہیں کہ اسے براہ راست دوسرے انسان کر رہے ہوں بلکہ اس کا تعلق ایسے نظام سے ہے جہاں لوگ سرمائے کے غیر مرئی بہاؤ اور اس کے باعث پیدا ہونے والے اجنبیت اور تجرید سے متاثر ہوتے ہیں۔

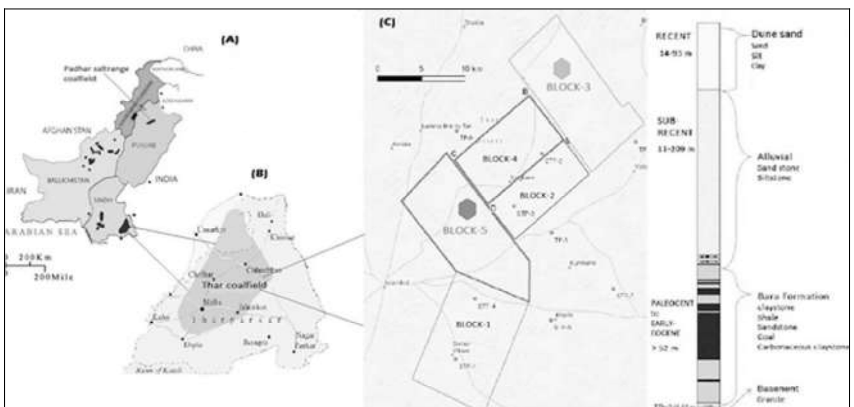
تھرواسی مسلسل نقل مکانی اور بے دخلی کے خطرے سے دوچار رہتے ہیں، حالانکہ وہ شاید پاکستان کے واحد لوگ ہیں جن کے پاس اپنے گھر ہیں، اب چاہے وہ گھاس پھونس کی جھونپڑی ہی کیوں نہ ہو۔ مشکل یہ ہے کہ ان کے پاس اپنی ہی ملکیت کے کاغذات موجود نہیں ہیں کیونکہ حکومت کی جانب سے اب تک باضابطہ سروے ہی نہیں کیا گیا۔ (دو سال قبل کلوئی اور اسلام کوٹ کا سروے کرنے کے بعد یہ منصوبہ ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا)۔ اس بات کی تصدیق عدالتی مقدمات کی اُس تعداد سے ہوتی ہے جن کا حوالہ مٹھی میں وکیل شوکت سندھی نے دیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ، "ظاہری بات ہے کہ لوگ پلاٹوں کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے، شرمناک بات یہ ہے کہ اِن میں سے کچھ صرف 50 مربع گز زمین کے لیے جان سے جا رہے ہیں جس کی قیمت بمشکل 50 ہزار روپے ہے۔"

اوپر دیا گیا نقشہ واضح کرتا ہے کہ تھر کے لوگ کیوں فکرمند ہیں، اور یہ کہ زمین کا باقاعدہ سروے نہ ہونے کی وجہ سے وسیع پیمانے پر طویل المدت ناہمواریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ تھر کے وسط میں 9 ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلے ایک بڑے رقبے کے نیچے کوئلے کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ رہائشی خوفزدہ ہیں کہ بالآخر انہیں یہ علاقہ خالی کرنے کو کہا جائے گا۔ اگر تھر کا کل رقبہ 19 ہزار مربع کلومیٹر ہے تو پھر مقامی آبادی کے لیے صرف 10 ہزار مربع کلومیٹر ہی بچتا ہے۔ حکومت کا دعویٰ یہ ہے کہ اس باقی ماندہ زمین کا آدھا حصہ قابل کاشت ہے اور آدھا ناقابل کاشت۔

اگر حکومت کے اس معیار کو تسلیم کرتے ہوئے قابل کاشت زمین کو تقسیم کیا جائے تو ہر خاندان کے لیے ساڑھے 3



بائیں جانب: گوتم راٹھی نے 15 اپریل 2025 کو چھاچھرو پریس کلب میں خطاب کرتے ہوئے کہا: "اگر آپ شاہ لطیف کو پڑھیں تو وہ اسے ڈھٹ کہتے ہیں۔ کرنل جیمز ٹوڈ کی راجستھان کی بنیادی تاریخ میں بھی یہی نام درج ہے۔ برطانوی دور میں تھر اور پارکر کو آپس میں ملا دیا گیا۔ یہ مارواڑ تھا، جو گریٹر راجستھان (مشرقی راجستھان، بیکانیر، جودھپور، جیسلمیر، مشرقی راجستھان) کا حصہ تھا"۔ درمیان میں: کھوکھراپار سے آئے گل شیر نے سرحد کی کہانیاں سنائیں؛ دائیں جانب: کالو میگھواڑ نے بتایا کہ کس طرح اس کا قبرستان، ترائی اور زمین بدمعاشوں نے تھیا لی ہے



نقشہ جس میں ضلع تھر کے وسط میں کوئلے کے ذخائر کا حجم گلابی رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ لوگ فکرمند ہیں کہ کان کنی کرنے کے لیے انہیں بالآخر یہ علاقہ خالی کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اس صورت میں ان کے پاس بہت ہی محدود وسائل باقی رہ جائیں گے۔

ماخذ: منیر و دیگر، جریدہ جیوکیمیکل ایکسپلوریشن

ایکڑ زمین بچتی ہے۔ یہ فوری حساب بتانے والے علی اکبر کا کہنا تھا کہ، "ہر خاندان کے لیے کم از کم ساڑھے 3 ایکڑ زمین کا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کر دیں، یہ کر کے جان چھڑائیں اور ہم سب پر احسان کریں"۔ اگر تھری افراد کا زمین پر حق تسلیم کر لیا جائے تو وہ اسے دوسروں کو لیز پر دے سکیں گے اور ان کے پاس اپنی ملکیت اور مالی تحفظ کا احساس ہوگا۔

ریاستی طاقت کا غیر منصفانہ استعمال ایک ایسا خلا پیدا کر دیتا ہے جہاں مقامی طاقت ور اپنی دھونس جما لیتے ہیں اور کاروباری افراد قوانین نہ ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب وڈیرے راستے بند کر کے چراگاہ تک جانے کا راستہ روک دیتے ہیں تو کوئی بچانے نہیں آتا۔ سرخ پگڑی، دھوتی اور گھسے ہوئے جوتے پہنے کالو میگھوار نے بتایا کہ اس کا قبرستان، چراگاہ اور تالاب گزشتہ 4 سال سے ایک بدمعاش کے قبضے میں ہیں۔ دکھ بھرے لہجے میں اس نے کہا کہ، "ہماری چیزیں چرالی جاتی ہیں، گھروں پر قبضہ کر لیا جاتا ہے، لیکن ہم غریب ہیں تو نام نہیں لے سکتے، پچھلی بار جب میں نے نام لیے تھے تو انہوں نے میرے ساتھ برا سلوک کیا تھا"۔ کالو نے 3 سال سے شکایت کرنا چھوڑ دی لیکن اب بہت ہو چکا ہے۔ ایچ آر سی پی کی ٹیم نے اس پر زور دیا کہ وہ تفصیل بتائے مگر پھر رہنے دیا، کیونکہ اس کمرے میں مخبر بھی ہو سکتے تھے۔

تھر میں رہنے والے ایک طرح سے اپنے انسانی حقوق سے زیادہ اپنے جانوروں کے حقوق اور انہیں بہتر طریقے سے

پالنے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ مٹھی میں ڈاکٹر معشوق علی کا کہنا تھا کہ، "ہمارا مویشی پالنے کا طریقہ صدیوں پرانا ہے۔ آپ کسی بھی گاؤں میں چلے جائیں، لوگوں کو یہ تک نہیں پتہ کہ محکمہ لائیواسٹاک یا اینیمل ہسبینڈری ڈیپارٹمنٹ نام کی کوئی چیز ہے"۔ اگر یہ خطہ 8 ملین یا سندھ کے 15 فیصد مویشیوں کا گھر ہے تو اس حوالے سے زیادہ تحقیق کیوں نہیں کی گئی؟ 300 ویٹرنری مراکز کام کیوں نہیں کرتے تا کہ جانوروں کو ویکسین لگائی جا سکے اور فوری طبی امداد فراہم کی جا سکے۔ ضلع بھر کے 40 ویٹرنری ملازمین 8 ملین جانوروں کی دیکھ بھال کیسے کر سکتے ہیں؟ حتیٰ کہ اگر جانوروں کا ڈاکٹر 5 گھنٹوں میں آپ کے گاؤں تک پہنچ بھی جائے تو بھی آپ کے پاس اپنی بیمار بکری کا علاج کروانے کے لیے 5 ہزار روپے کہاں سے آئیں گے۔

نمائشی حکومت

ایچ آر سی پی کے کیمپ میں جن افراد سے ملاقات ہوئی، اگر میں صرف اُن کی کہی باتیں دہرادوں لیکن اس نفاست اور گہرائی کو آپ تک نہ پہنچا سکوں تو یہ ناانصافی ہوگی۔ ہر شخص نے یہی کوشش کی کہ خود سے پہلے بات کرنے والے کی باتوں کو نہ دہرائے بلکہ جو معلومات پہنچائی جا رہی ہیں ان میں اضافہ کرے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں موجود تمام افراد اس وقت اور کوشش کی قدر کر رہے تھے جو ہم نے چھاچھرو تک پہنچنے کے لیے کی، اور چاہتے تھے کہ ایچ آر سی پی ٹیم کو ہر ممکن حد تک متنوع بریفنگ دی جائے۔ (عام طور پر سیمینار میں مرد حضرات اس وقت تک بولتے رہتے ہیں جب تک کہ مائیک کو ان کے ہاتھوں سے زبردستی نہ چھین لیا جائے)۔ لیکن یہاں میں نے کچھ اور ہی دیکھا: برادری کا جذبہ اور باہمی احترام۔

مردوں کی شکایتیں الگ الگ نہیں تھیں؛ ان سب کے پیچھے کوئی گہرا ربط موجود تھا۔ جوابات کی جستجو میں، میں چند مفکرین تک پہنچی جن کے نظریات حیرت انگیز طور پر اس صورتحال پر فٹ بیٹھتے تھے (دلچسپی رکھنے والوں کے لیے: کلاڈ لیوی اسٹراس، ڈیوڈ ہاروی، آرٹورو ایسکوبار، جیمز سی اسکاٹ، جیمز فرگوسن)۔ جتنا زیادہ میں نے اُن کے کام کو پڑھا، اتنا ہی تھر مجھے جدیدیت کے ساتھ ساتھ ایک پرتشدد ٹکراؤ کی نصابی مثال دکھائی دینے لگا۔

ایسے دور افتادہ یا تنہا علاقے اس وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہیں جب ان کی دہلیز پر جدید ترقی کی طاقتور لہر آتی ہے۔ تھر کے معاملے میں یہ کوئلے کی دریافت سے شروع ہوا۔ سرمایہ داری نے نفع، ذاتی مفاد اور تیز رفتار زندگی لا کر اس بگاڑ کو اور تیز کیا۔ اپنی خوراک، کپڑے اور رہائش کے بندوبست میں خود کفیل خطے کو بتایا گیا کہ وہ پسماندہ ہے اور اسے زیادہ بہتر، آسان، صحت مند اور دولت کے ساتھ زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔ پھر بارٹر سسٹم کی جگہ نقدی نے لے لی، ریلوے اور سڑکوں کے لیے چراہ گاہوں کی زمین نگلی گئی، ڈیجیٹل بینکنگ نظام متعارف کروایا گیا اور مویشیوں اور کھلی زمین کے ساتھ گزارا کرنے والے خاندان کو روزانہ اجرت پر کام کے لیے مجبور کر دیا گیا تا کہ اس کے بچے 10 روپے میں کراچی کی فیکٹری کے بنے بسکٹ خرید سکیں۔

جب کوئلے کی طلب میں ریاست کی نظر تھر جیسے علاقوں پر پڑتی ہے تو سب سے پہلے وہ انہیں سمجھنا آسان بناتی ہے، انہیں ایسے قابل فہم اور قابل گرفت بنایا جاتا ہے کہ نقشے بنائے جائیں، سروے ہوں، سڑکیں بچھائی جائیں جیسے کہ یہ کوئی خالی کاغذ ہو۔ جب یہ نیا نظام ضابطوں میں ڈھل کر تھر کو چلانے کا سرکاری طریقہ بن گیا تو صدیوں پرانی مقامی دانائی اور خودمختاری تبدیل ہوگئی۔ سڑک نے ریت پر قدموں کے نشان پڑھنے جیسی صدیوں پرانی حکمت یکسر مٹا دی۔

سڑک نے اس سرزمین میں داخلے کا راستہ ہموار کیا تا کہ سرمایہ داری عام زمینوں (چراگاہوں اور ترائی) پر یلغار کر کے انہیں منافع کمانے والے اثاثوں میں بدل سکے۔

اب کارپوریشنیں معدنیات نکال سکتی ہیں، مزدوروں کا استحصال کر سکتی ہیں اور دیہات کے درمیان کی مشترکہ زمینیں ہڑپ سکتی ہیں۔ اس عمل کو بے دخلی کے ذریعے دولت سمیٹنا کہا جاتا ہے۔ مٹھی میں مندر کے رہنما کرشن شرما نے اس کی ایک مثال دیتے ہوئے کہا کہ: "تھر کے کوئلے پر اتنی بات ہو رہی ہے کہ یہاں کے نمک کے لیے کم ہی جگہ بچی ہے۔" سرحد پر سندھ حکومت نے حب سالٹ کو لیز دے رکھی ہے جس کی مشینری ان کے ریو اور موکھائی کے پلانٹس میں اتنا نمک تیار کرتی ہے جتنا مزدور ہاتھ سے نہیں کر سکتے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ مزدور جو موسم سرما میں سمندری نمک سے ایک سال کا روزگار کما لیتا تھا، اب اس کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے۔

نبی سر گاؤں کے پانی سے ایک آبی ذخیرہ بنایا گیا مگر یہ عوام کے لیے نہیں بلکہ بجلی گھر کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے ہے۔ یہ پاور پلانٹ گرڈ میں 2700 میگا واٹ بجلی بھیجتا ہے مگر جہاں اسے بنایا گیا وہاں کے لیے 10 میگا واٹ بجلی بھی نہیں پہنچتی۔ لوگوں کو پانی کے ٹینکروں کے لیے 18 ہزار روپے دینے پڑتے ہیں۔ چھاچھرو میں کارکن قمرالدین رحیمو کا طنزیہ انداز میں کہنا تھا کہ، " کہتے ہیں تھر پاکستان کو بدل دے گا، مگر پاکستان کو کون بدلے گا؟ کوئلہ ڈھونڈ نکالا ہے تو کیا آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم کوئلہ کھائیں گے؟ جہاں سے انہیں کوئلہ ملا ہے وہاں روشنی تک نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا کہ حتیٰ کہ تھر ریل بھی کسی ظالمانہ مذاق سے کم نہیں، کیونکہ حکومت نہ صرف ان کی زمین لے رہی ہے بلکہ راستہ بنانے کے لیے درخت بھی کاٹ رہی ہے جو کہ سراسر توہین آمیز ہے کیونکہ ایک درخت 12 بکریوں کو خوراک فراہم کرتا ہے۔ وہ خوف کے ساتھ اپنے سامنے این ای ڈی یونیورسٹی کا کیمپس تعمیر ہوتے دیکھتے رہے جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک چراگاہ کی بڑی پٹی پر بنایا گیا ہے۔ کیا واقعی یہ ساری تعمیرات ضروری ہیں؟ علی اکبر نے دلیل دی کہ: " گزشتہ 15 سال سے تھر پارکر وسائل پھینکنے کی جگہ بنا ہوا ہے۔ یہاں اتنا سول ورک ہوا ہے کہ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ آپ دو دو سو ڈسپنسریاں بنا رہے ہیں۔" ائیرپورٹ تو صرف 'کارپوریٹ طبقے' کے لیے ہے کیونکہ تھری لوگ تو جہاز کا کرایہ برداشت ہی نہیں کر سکتے۔

جدیدیت اور پیسہ خرچ کرنے کی دوڑ 'آئسومورفک ممکری' کہلاتی ہے۔ (یعنی ریاست، ترقی یافتہ ممالک کے کامیاب ڈھانچوں اور بظاہر دکھائی دینے والے طریقہ کار کی نقل کرتی ہے، لیکن مگر درحقیقت انہیں چلانے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی)۔ اسی لیے غلام مرتضیٰ سمیجو نے کہا کہ وہ منتخب یونین کونسلرز کی کارکردگی پر بس یہی رپورٹ کر سکتے ہیں کہ چھاچھرو کے 12 لاکھ روپے کے بجٹ سے چوک سے پریس کلب تک ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ باقی شہر تو کچرے کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہا ہے۔ آئسومورفک ممی کری (نمائشی دوڑ) کی وجہ سے ہی آج صرف چند ریورس اوسموسس پلانٹس چل رہے ہیں جن کے عملے کو یا تو تنخواہ نہیں ملتی یا ان کی تنخواہ بمشکل کم از کم اجرت کے برابر ہے۔ یہی حال اس ہیلتھ یونٹ کا ہے جو مشرف دور میں کھلا تھا۔ اسے ترقی دے کر تعلقہ ہیڈکوارٹرز اسپتال بنا دیا گیا اور نئی تختی لگا دی گئی، مگر قمرالدین رحیمو کے مطابق یہ اب بھی اپنے اصل 20 بستروں پر ہی چلایا جا رہا ہے۔

لیکن ترقی کے خلاف کون ہے؟ ظاہر ہے تھر کے لوگ بھی سڑک کی خواہش رکھتے تھے۔ میں نے جس جس قصبے کا دورہ کیا، وہاں کے لوگوں نے رابطہ سڑکوں، بجلی، پانی، اسپتالوں اور ہر تعلیمی سال کے لیے نئی کتابوں کا مطالبہ کیا۔ کوئی بھی تنہائی نہیں چاہتا، نہ بھوکا رہنا چاہتا ہے اور نہ ہی خوراک اور دواؤں سے محروم ہونا چاہتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح کی 'جدیدیت' کس طرح آتی ہے، اس کا فیصلہ کون کرتا ہے، اس سے کس کو فائدہ ہوتا ہے اور کون پیچھے رہ جاتا ہے۔ سڑکیں کہاں بنیں گی، اس بات کا فیصلہ تھر کے لوگ نہیں بلکہ حکومت کرتی ہے۔ پھر ان سڑکوں کو عوامی بھلائی کے طور پر

پیش کیا جاتا ہے۔ ترقی مسائل ختم نہیں کرتی، بلکہ انہیں ایسے تبدیل کر دیتی ہے کہ حکومت یا اداروں کی مداخلت درست ثابت کرے۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ جن مفکرین کا ذکر کیا گیا انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ روایتی معاشرے ناانصافی یا سختیوں سے خالی ہیں لیکن ترقی کے نام پر انہیں ختم کرنا تباہی لاتا ہے۔ تھر کے لوگ جب تک خود فیصلے نہیں کریں گے، بڑا صاحب صرف اسلام آباد کے بابو سے تبدیل ہو جائے گا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ تھر سے منتخب ہونے والے ارکان قومی اور صوبائی اسمبلی کا اپنا تعلق تھر سے نہیں تھا۔ (لیکن پیر جیسے کہ جیلانی، مخدوم، میر کا تعلق میرپور خاص، سانگھڑ، عمرکوٹ سے تھا) جب تک سڑک نہیں بنائی گئی، اس دوران، ڈھانچے اور توانائی کے منصوبوں کے تمام فیصلے کہیں اور ہی کیے گئے۔

علاج کے نام پر بیماری

میرے خیال میں، جدیدیت اور سرمایہ داری کے نظام کے نام پر ہونے والے اس ظلم کی سب سے بڑی مثال خودکشی ہے، اور لوگ اسی کی بات کر رہے تھے۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ میں سے سات تھرواسی اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ صرف انفرادی مسائل نہیں بلکہ گہری بے بسی کی نشانی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں ثقافت کمزور پڑ رہی ہے، لوگ استحصال کا شکار ہیں اور زندگی کے طور طریقے ختم کیے جا رہے ہیں۔

ابتدائی میڈیا کوریج کے بعد حکومت نے کچھ توجہ دی، ایک تحقیق کی گئی، بسوں میں صحافیوں کو صورتحال دیکھنے کے لیے بھیجا گیا اور ایک ٹول؛ فری ہیلپ لائن بھی قائم کی گئی۔ ذرا سوچیں، تھر کے لوگ فون ملا رہے ہیں۔ موبائل فون اور یکطرفہ محبت کو سب سے بڑی وجوہات قرار دیا گیا لیکن یہ وضاحتیں مٹھی میں ہونے والی مشاورت میں کسی کو بھی مطمئن نہیں کر سکیں۔ وکیل بھورومل کوہلی جاننا چاہتے تھے کہ ہر نوجوان عورت کی خودکشی کی ایک ہی وجہ کیوں بتائی جاتی ہے کہ اس کا "ذہنی توازن" درست نہیں تھا۔ دیگر افراد کا کہنا تھا کہ خودکشیاں اس لیے کی جا رہی ہیں کیونکہ لوگ اپنے مائیکرو فنانس قرضے واپس نہیں کر پاتے۔

خودکشی کی وجوہات پر اتفاق نہ ہونے کی ایک وجہ پوسٹ مارٹم نہ کیا جانا بھی ہے۔ قانونی طور پر تو مشتبہ معاملات میں پوسٹ مارٹم ضروری ہے لیکن برادری کی جانب سے مزاحمت کی صورت میں پولیس پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عملی مشکلات بھی ہیں، ضلع کی نگرانی کرنے والے ایس ایس پی عادل میمن کے مطابق، اگر کوئی تھر کے کسی دور دراز علاقے میں خودکشی کر لے تو لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے کسی سینٹر تک لے جانا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک افسر کو ذمہ داری دینی ہوتی ہے جو نمونوں کو سکھر میں قریب ترین ماہر کے پاس پہنچائے۔ چھاچھرو میں کوئی خاتون ایم ایل او موجود نہیں اور جہاں ہیں وہ بھی کیس کرنے سے ہچکچاتی ہیں کیونکہ پھر اس حوالے سے انہیں بار بار عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔

ایک ماہر معیشت کا لائحہ عمل

تھرپارکر کے لیے کئی منصوبے زیرغور ہیں لیکن ان کی خود اعتمادی خوفزدہ کرنے والی ہے، اس لیے میں نے پوچھا کہ تھرواسی کون سے حل کو ترجیح دیں گے، اور ایک ہی نام بار بار سامنے آیا جو ہے ماہر معیشت ڈاکٹر قیصر بنگالی کا۔

مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر قیصر بنگالی کا سندھ میں غربت کم کرنے کا منصوبہ تھر میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ خطے کو برباد کیے بغیر 'ترقی' کس طرح ہو۔ منصوبے میں ہر 40 کلومیٹر کے فاصلے پر قصبہ، بارش کا پانی محفوظ کرنے کا نظام، موبائل اسکول اور صحت کی سہولیات شامل تھیں۔ ان منصوبوں میں سیمنٹ پر مبنی بھاری اخراجات کو ترجیح نہیں دی گئی تھی اور انہیں 2021 میں میں کابینہ سے منظوری بھی حاصل ہوئی تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ اب تک عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر قیصر بنگالی کا منصوبہ اس لیے پسند کیا جاتا ہے کیونکہ یہ تھری علم اور تجربے سے رہنمائی لیتا ہے۔ مثال کے طور پر لوگ صحرا میں کیسے آباد ہوئے۔ نقشوں میں دکھایا گیا ہے کہ یہاں کے گاؤں تقریباً برابر فاصلے پر موجود ہیں۔ تھر کے لوگوں نے اپنی بستیاں کنوؤں کی جگہ اور پانی کی دستیابی دیکھتے ہوئے بسائی تھیں۔ یہاں کوئی گنجان شہر موجود نہیں ہیں۔

یہ اصول جدید شہری منصوبہ بندی کے خلاف ہے۔ ایک ریاست 5 جھونپڑیوں والے گاؤں کے لیے اسپتال قائم کرنے اور اس کا انتظام کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی لیکن 10 ہزار آبادی پر مشتمل گاؤں کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر قیصر بنگالی کا یہ جواب ایک درمیانہ راستہ اپناتا ہے جس میں وہ دیہی جھرمٹ کی تجویز دیتے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ سجاول کے چوہر جمالی میں یہ کامیاب ہو چکا ہے جہاں دیہاتوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے 40 کلومیٹر کے دائرے میں 17 سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ حکومت تک پہنچنے والی کچھ اور تجاویز میں کہا گیا ہے کہ دیہات کے درمیان 10 کلومیٹر کا فاصلہ رکھا جائے۔ یہ تجاویز سہیل سانگی، علی اکبر راحمو اور تھر کے چند سرگرم کارکنوں کی جانب سے دی گئیں۔

یہ فارمولا ایک قدم آگے بڑھ کر دیہی ترقیاتی مراکز کو اہم کردار دیتا ہے: مثلاً مٹھی کو سرکاری انتظامات کے لیے، نگر کو کوئلے کی صنعت کے لیے، اور اسی طرح دیگر مقامات کو مخصوص مقاصد کے لیے۔ لیکن یہ سب کچھ جلد ہونا ضروری ہے کیونکہ لینڈ مافیا کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر قیصر بنگالی کا کہنا ہے کہ پلاٹوں کے سائز پر کڑی نظر رکھنا ہوگی تاکہ پانی کی کمی کے باعث زیادہ گنجان بستیاں وجود میں نہ آئیں۔

میں ڈاکٹر قیصر بنگالی کو دلیل دوں کہ سرمایہ داری ثقافت کو تباہ کر دیتی ہے تو وہ صاف گوئی سے جواب دیتے ہیں کہ "تھر میں وہ ثقافت جس کی آپ نے بات کی اصل میں بھوک تھی۔" ان کا نسخہ مزید کڑا ہے، کہتے ہیں کہ چھاچھرو کو بتدریج ختم کر دینا چاہیے کیونکہ وہاں سرے سے ہی پانی نہیں ہے۔ ڈاکٹر قیصر کے مطابق یہ جگہ زیادہ آبادی والی نہیں بننی چاہیے، مویشی بھی روزگار کا ذریعہ نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے لیے زیادہ پانی درکار ہوتا ہے۔ ان کا سنجیدگی کے ساتھ ماننا ہے کہ ویسے بھی قحط میں آدھے مویشی مر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر قیصر بنگالی کا رویہ مایوس کن ہو سکتا ہے، مگر ان کا فارمولا اُمید جگاتا ہے۔ اسلام کوٹ، مٹھی اور چھاچھرو کے لوگوں سے اس مختصر ملاقات کے بعد ایک بات تو واضح ہے کہ تھر کو چلانا آسان نہیں کیونکہ عام طریقے بظاہر فائدہ دیتے ہیں، لیکن اصل میں زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔

تھر میں جو ہوتا ہے، وہیں رہ جاتا ہے

جب ایس صاحب نے اسلام کوٹ میں ہونے والی کچہری سمیٹی اور میں مرد حضرات کے گروپ سے ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر رہی تھی تو اچانک احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں، مجھے کہا گیا کہ، "یہ زیادتی ہے، آپ نے ختم نہیں کیا۔"

انہوں نے سنجیدگی سے گروپ کو بتایا کہ، "یہ ہمارا امتحان ہے: ہمارا ظرف ہے کہ ہم اس بات کو کتنا اپنی حد تک رکھتے ہیں۔ ایک صحافی تو اپنی کہانی کے لیے کچھ بھی کرے گا۔" مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

لیکن باقی لوگ سمجھ جاتے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا، "کیا ہوا؟"

میں نے جواب دیا، "کچھ نہیں، مجھے علم نہیں، کیا ہوا؟" ساتھ ہی اپنا بیگ اور نوٹ بک اٹھا کر جانے کی تیاری کرتی ہوں۔

اتنے میں جواب آتا ہے، "ہاں ہم نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔"

یوں ڈھٹ کے دل میں، اسلام کوٹ کی اُس ٹھنڈی رات میں کسی نے کچھ نہیں دیکھا، سنانے کو کوئی کہانی نہ تھی، نہ کوئی کچھ جانتا تھا۔

سیکولر قائداعظم اور پاکستان: ایک تحقیقی جائزہ

سب سے بڑی غیر مسلم برادری ہونے کے باوجود سندھ میں جبری تبدیلی مذہب اور اغوا کے واقعات عام ہیں

تمہید

پاکستان کے قیام کے بعد سے یہ سوال ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کہ آیا بانی پاکستان محمد علی جناح کا تصور ایک مذہبی ریاست کا تھا یا ایک سیکولر ریاست۔ ہمارے ہاں عموماً "سیکولرزم" کو منفی رنگ دیا جاتا ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اس کا مطلب دین بیزاری، عریانی یا مغربی تہذیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم دراصل ریاست کی غیر جانب داری کا نام ہے—ایسا نظام جہاں ریاست ہر شہری کو بلا تفریق مذہب یا عقیدہ برابر حیثیت دیتی ہے۔

سیکولرزم کا تاریخی پس منظر

یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں کلیسا نے ریاست پر غلبہ حاصل کر رکھا تھا۔ بادشاہ بھی مذہبی جواز سے حکومت کرتے تھے۔ عوام انصاف اور آزادی سے محروم تھے۔ اس استبداد کے خلاف عوامی تحریک اٹھی جس نے مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دیا اور ریاستی امور کو عوامی نمائندوں کے سپرد کیا۔ یہی تحریک بعد میں "سیکولرزم" کے نام سے جانی گئی۔

سیکولرزم کی اقسام

1۔ غیر جانب دارانہ سیکولرزم: ریاست سب مذاہب کو آزادی دیتی ہے اور خود غیر جانبدار رہتی ہے۔

2۔ مضبوط سیکولرزم: ریاست مذہب کو عوامی زندگی سے الگ رکھتی ہے (جیسا کہ فرانس میں ہے)۔

3۔ کثرت پسند سیکولرزم: ریاست سب مذاہب کو مساوی حیثیت دیتی ہے اور کسی کو فوقیت نہیں دیتی۔

مسلم دنیا میں سیکولر مثالیں

ترکی: کمال اتاترک کے دور میں ریاست کو مکمل طور پر سیکولر بنایا گیا۔ مذہب کو ذاتی معاملہ قرار دے کر ریاستی پالیسیوں کو مذہب سے آزاد کر دیا گیا۔

البانیہ: یورپ کا مسلمان اکثریتی ملک ہے جہاں ریاست ہر شہری کو برابر مانتی ہے اور مذہب کو سیاست سے الگ رکھتی ہے۔

آذربائیجان: ریاست مذہب کو مکمل طور پر ذاتی معاملہ تصور کرتی ہے، اس لیے "اقلیت" کا تصور تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

بنگلہ دیش: 1972 کے آئین میں سیکولرزم بنیادی اصول کے طور پر شامل ہوا، بعد میں اسلام کو ریاستی مذہب بھی قرار دیا گیا۔ آج یہاں ایک "جزوی سیکولر" نظام ہے جہاں اسلام ریاستی مذہب ضرور ہے مگر سیکولرزم بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کا حصہ ہے۔

انڈونیشیا: دنیا کی سب سے بڑی مسلم اکثریتی ریاست ہے۔ اس کا آئین "پانچ شیلا" کے اصولوں پر مبنی ہے جن میں کسی ایک مذہب کو فوقیت نہیں دی گئی۔ ریاست چھ مذاہب کو سرکاری طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اسے اکثر "سیکولر مگر مذہب دوست ریاست" کہا جاتا ہے۔

ملائیشیا: آئین اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیتا ہے لیکن مسیحی، ہندو اور بدھ مت کے ماننے والوں کو بھی آئینی آزادی حاصل ہے۔ اسے ''اسلامی مگر جزوی سیکولر ریاست" کہا جا سکتا ہے۔

تیونس: عرب دنیا کا سب سے زیادہ سیکولر رجحان رکھنے والا ملک ہے۔ آئین اسلام کو ریاستی مذہب مانتا ہے مگر ریاستی پالیسی زیادہ تر شہری مساوات اور مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے پر مبنی ہے۔

یہ مثالیں ثابت کرتی ہیں کہ سیکولرزم کا مطلب دین دشمنی نہیں بلکہ شہری مساوات اور ریاست کی غیر جانب داری ہے۔

پاکستان میں سیکولرزم کی ضرورت

پاکستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی اور احمدی بھی بستے ہیں۔ مگر آئینی تضادات نے اس مساوات کو کمزور کر دیا ہے۔

دفعہ 25: سب شہری قانون کے سامنے برابر ہیں۔

مگر دفعہ 41(2) صدر کے لیے اور دفعہ 91 وزیرِاعظم کے لیے صرف مسلمان ہونا لازمی قرار دیتی ہے۔

یوں آئین ایک طرف مساوات کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف مذہب کی بنیاد پر امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

قائداعظم کا وژن

11 اگست 1947 کو قانون ساز اسمبلی میں قائداعظم نے فرمایا:

"آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں یا پاکستان کی کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا عقیدے سے ہو، اس کا ریاست کے امور سے کوئی تعلق نہیں۔"

یہ بیان واضح اعلان تھا کہ پاکستان میں مذہب ذاتی معاملہ ہوگا اور ریاست سب شہریوں کے حقوق کی محافظ ہوگی۔

قائداعظم کے بعد کی حقیقت

ہندو برادری

سب سے بڑی غیر مسلم برادری ہونے کے باوجود سندھ میں جبری تبدیلی مذہب اور اغوا کے واقعات عام ہیں۔

مسیحی برادری کو تعلیم اور صحت کے شعبے میں نمایاں خدمات کے باوجود توہینِ مذہب کے جھوٹے مقدمات اور جڑانوالہ حملے (2023) جیسے مسائل درپیش ہیں

سکھ اور پارسی تعداد میں کم ہیں مگر جائیدادوں پر قبضے، عبادت گاہوں کی توہین اور سیاسی نمائندگی کی کمی ان کے بڑے مسائل ہیں۔

احمدیہ جماعت

احمدیہ جماعت جس نے تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا دفاع خارجہ معیشت تعلیم اور سائنس کے شعبوں اس جماعت کے افراد کی نمایاں خدمات ہیں، اس کے باوجود اس کے افراد زیادہ امتیاز کا شکار ہیں۔ 1974 میں اس جماعت کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔ 1984 میں انہیں مذہبی شعائر استعمال کرنے پر مکمل پابندیاں لگا دی گئیں۔

عبادت گاہیں مسمار کی گئیں، ووٹر فہرست میں علیحدگی کی گئی، اور قبروں کی بے حرمتی جیسے واقعات عام ہو گئے۔

جبکہ قائداعظم کا خواب ایک ایسی ریاست کا تھا جہاں سب شہری بلا تفریق برابر ہوں۔ مگر پاکستان میں وقت کے ساتھ مذہب کو سیاست کا ہتھیار بنا کر شہریوں کو اکثریت اور اقلیت میں تقسیم کر دیا گیا۔ آج ہندو، مسیحی، سکھ، پارسی سمیت سبھی اقلیتیں کسی نہ کسی درجے میں امتیاز اور محرومی کا شکار ہیں۔

یہ وقت ہے کہ ہم قائداعظم کے وژن کی طرف لوٹیں ریاست کو غیر جانب دار بنایا جائے۔ سب شہریوں کو مساوی حقوق دیے جائیں، اور آئینی تضادات ختم کیے جائیں اور ملک عزیز کو امن و آشتی کا گہوارہ بنائیں جہاں کے ہر شہری کو تمام حقوق بلا امتیاز اور تفریق حاصل ہوں۔

(تحریر: طارق شیلے لاہور)

☆☆☆

کاروانِ مزاحمت

اشرف جہانگیر قاضی

کمزور ہونا غلط ہے۔ درست ہونا کافی نہیں۔ اچھا بننے کے لیے طاقتور ہونا ضروری ہے

ہم اس وقت علاقائی اور عالمی تاریخ کے ایک سنگِ میل پر کھڑے ہیں، جو کئی اہم واقعات کے نتیجے میں سامنے آیا ہے۔ امریکہ کی اخلاقی، ادارہ جاتی، سیاسی اور معاشی زوال پذیری۔ اسرائیل کی پاگل پن جیسی جارحیت، جس نے بالآخر امریکہ کو خطے اور دنیا میں استحکام کے ضامن کے طور پر ناقابلِ اعتبار بنا دیا ہے۔

عرب اشرافیہ کا یہ احساس کہ وہ اب قومی ذلت کے بدلے بیرونی تحفظ پر بھروسہ نہیں کر سکتے تاکہ اپنی عوامی ناراضی سے بچ سکیں۔ چین کا یہ ادراک کہ اس کی سفارت کاری، خوف زدہ اور ضدی امریکہ کے ساتھ ٹکراؤ کو زیادہ دیر تک مؤخر نہیں کر سکتی۔ افریقہ اور ایشیا کی ایک وسیع مسلم دنیا کا ابھرنا، جو مغرب سے نجات کے لیے مشرق کے ساتھ شمولیت کا انتظار کر رہی ہے۔ بھارت کی ناکامی کہ وہ خطے کی طاقت سے عالمی طاقت میں تبدیل ہو اور امریکہ کے لیے چین کے خلاف قابلِ اعتبار شراکت دار بن سکے۔

اس سب سے بڑھ کر موسمیاتی تبدیلی ہے، ایک ایسے انسانی عہد (Anthropocene) میں، جہاں انسانی سرگرمیاں درجہ حرارت بڑھنے اور نباتات و حیوانات — بشمول انسان — کی قسمت کا بنیادی تعین کرنے والا عنصر بن گئی ہیں۔ بڑی صنعتی طاقتوں کی غیر ذمہ داری کے باعث موسمیاتی تبدیلی جلد ہی ناقابلِ تلافی ہو جائے گی۔

موسمیاتی تبدیلی کا نظم و نسق اور اس کے مطابق ڈھل جانا شاید تباہی کو کچھ وقت کے لیے مؤخر کر دے، لیکن یہ انسانی تہذیب کی فنا — ممکنہ طور پر اسی صدی کے اندر — کو روک نہیں سکتا۔ چومسکی نے کہا تھا کہ خدا کی سب سے عظیم مخلوق بننے کے بجائے، انسان سب سے احمق اور سب سے مختصر العمر جانور ثابت ہوگا۔ یہ سب کچھ "ڈومز ڈے کلاک" کے حالیہ فیصلے میں جھلکتا ہے، جو "آدھی رات" سے صرف 89 سیکنڈ کے فاصلے پر ہے — یعنی اب تک کا سب سے زیادہ قریب۔ اگلا فیصلہ، جنوری میں، اور بھی قریب ہوگا۔

یہ وہ عالمی تناظر ہے جس میں ہم آج محصور اور بے بس فلسطینی عوام کے خلاف ایک صدی پر محیط نسل کشی کے عمل کے انجام کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ بے مثال جرم برطانیہ نے شروع کیا تھا اور امریکہ کی مکمل ملی بھگت کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ فلسطین ختم ہو گیا تو عرب اور مسلم دنیا ایک خوفناک اخلاقی اور تہذیبی ناکامی کا شکار ہو گی، جس سے نکلنا ممکن نہ ہوگا۔ امریکہ اور اسرائیل کی نسل کشی پر مبنی پالیسی نے فلسطین کے لیے اقوامِ متحدہ کے منظور کردہ دو ریاستی حل کو ناممکن بنا دیا ہے۔ چنانچہ اسرائیل نے اپنے وجود کا حق کھو دیا ہے۔

اب صرف ایک منصفانہ حل باقی رہ گیا ہے: فلسطین کی آزادی، جس میں تمام مذاہب کے لوگ — جو وہاں رہنے کے حق دار ہیں، بشمول وہ تمام فلسطینی جنہیں واپسی کا بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ حق حاصل ہے — باہمی امن، انصاف اور ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکیں۔

فلسطین کے المیے کے تمام دیگر ممکنہ حل امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کی منافقت، لالچ اور اسرائیل کی نسل پرستانہ اور مجرمانہ ریاست کی حمایت کے باعث ناممکن بنا دیے گئے ہیں۔

موسمیاتی تبدیلی کا نظم و نسق اور اس کے مطابق ڈھل جانا شاید تباہی کو کچھ وقت کے لیے مؤخر کر دے، لیکن یہ انسانی تہذیب کی فنا — ممکنہ طور پر اسی صدی کے اندر — کو روک نہیں سکتا۔ چومسکی نے کہا تھا کہ خدا کی سب سے عظیم مخلوق بننے کے بجائے، انسان سب سے احمق اور سب سے مختصر العمر جانور ثابت ہوگا۔ یہ سب کچھ "ڈومز ڈے کلاک" کے حالیہ فیصلے میں جھلکتا ہے، جو "آدھی رات" سے صرف 89 سیکنڈ کے فاصلے پر ہے

اب کیا کیا جائے؟ کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیسے کیا جائے؟ کہاں سے آغاز کیا جائے؟

اگر ان سوالات کے متفقہ اور عملی جوابات فلسطین کی نسل کشی کے حوالے سے تلاش اور نافذ کیے جا سکیں تو باقی عالمی چیلنجز کو بھی اسی طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

تاریخی طور پر، طاقتور نظام ہمیشہ ایسے معقول اور عملی جوابات کی راہ میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔ یہ انسانی تاریخ کا جزو لاینفک رہا ہے۔ عظیم دماغوں کو چنا جاتا رہا کہ وہ اس ہٹ دھرمی کے لیے دلکش اور قائل کرنے والی دلیلیں گھڑ سکیں۔ آج کا فرق یہ ہے کہ انسانیت کے پاس خود کو فنا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اب خطرات وجودی ہیں۔

ایلیکس کیری نے کہا تھا کہ "نچلی سطح" کا پروپیگنڈا عوام کو ان کے عقائد، خوف اور تعصبات کے ذریعے قابو میں رکھنے کے لیے بنایا جاتا ہے، جبکہ "بالائی سطح" کا پروپیگنڈا اعلیٰ اور متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو تسلی دینے کے لیے گھڑا جاتا ہے تاکہ وہ خود کو شائستہ اور نیک سمجھ سکیں، جب کہ حقیقت میں وہ اپنے آقاؤں کی ہوس پرستی اور لالچ کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے "کمپرادور دانشور" معاشرے کے بدترین افراد میں شمار ہوتے ہیں۔

پھر بھی، چومسکی کہتے ہیں کہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو فرق ڈال سکتی ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگ "خاموش اور مصلحت پسند" نہ رہیں اور استحصالی طبقوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے زندگی کو مشکل بنا دیں۔ ہر طرح کے فورمز پر سوال پوچھتے رہنا بھی مؤثر ہو سکتا ہے۔

طاقتور نظام کبھی کبھار کے احتجاج سے نہیں گھبراتے، بلکہ وہ انہیں اپنی رواداری اور آزادیٔ اظہار کے احترام کا ثبوت سمجھ کر خوش آمدید کہتے ہیں۔ کوئی بھی جدوجہد اس وقت بامعنی اور بالآخر کامیاب ہو سکتی ہے جب وہ ایک منظم اور مسلسل تعلم کا عمل ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اصل مرد کمزور مردوں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں عورتیں اکثر زیادہ مضبوط اور باہمت ثابت ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ماؤ نے کہا تھا: وہ "آدھا آسمان تھامے ہوئے ہیں"۔ اسی لیے انہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنا جہان گھر تک محدود رکھیں اور اطاعت، صبر اور برداشت میں نیکی تلاش کریں۔ جو عورتیں ان اوصاف میں سبقت لے جائیں وہ مردوں کی نظر میں قابلِ پرستش قرار پاتی ہیں — اکثر محض خیالوں میں۔

مرد کبھی یہ سوال نہیں پوچھتے کہ اگر عورتوں کو عقل خدا کی طرف سے دی گئی تھی تو وہ فضول کیوں تھی، حالانکہ اکثر وہ جانتے ہیں کہ عورتیں ان سے زیادہ عقلمند، مضبوط اور دلیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ کلیدی مسائل سے آغاز کرتے ہوئے، میں نے فلسطین پر توجہ مرکوز کی، سوالات اٹھائے، چومسکی اور کیری کا حوالہ دیا، اور خواتین کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اچھی باتیں مزید اچھی باتوں کو جنم دیتی ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے اندر اور باہر کی موجودہ صورتحال پر بے چینی محسوس کرنی چاہیے۔ یہ بے چینی سوچ کو جنم دے گی، سوچ غصے کو، غصہ عمل کو، اور عمل نجات کو۔

لہٰذا ہمیں یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم پاکستان — جو ہمارا واحد ملک ہے — اور زمین — جو ہماری ماں ہے — کے لیے کچھ اچھا کرتے رہیں۔

گلگت بلتستان میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور قتل کے واقعات

اسرارالدین اسرار

گلگت بلتستان میں ماضی میں بھی ایسے لرزہ خیز واقعات پیش آتے رہے ہیں



گلگت ایک بار پھر ایک نہایت افسوسناک اور ہلا دینے والے واقعے سے لرز اٹھا ہے۔ راجہ کاشان، ایک فرسٹ ایئر کا طالب علم، مبینہ طور پر اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں اغوا کیا گیا، سکارکوئی پل پر لے جایا گیا اور بدفعلی کی ایک سفاک کوشش کا نشانہ بنایا گیا۔ اطلاعات کے مطابق، اپنی عزت بچانے کی کوشش میں کاشان نے یا تو دریا میں چھلانگ لگا دی یا پھر اسے قتل کر کے پھینک دیا گیا۔ پولیس نے دو ملزمان کو گرفتار کر کے جسمانی ریمانڈ پر لیا ہے اور تفتیش جاری ہے۔

ایس ایس پی اسحاق حسین نے ڈیلی کے ٹو ڈیجیٹل کو انٹرویو میں بتایا کہ پولیس یہ جانچنے کی کوشش کر رہی ہے کہ آیا متاثرہ طالب علم کو قتل کرنے کے بعد دریا میں پھینکا گیا یا اس نے خود اپنی جان بچانے کے لیے چھلانگ لگائی۔ مقدمہ زیرِ تفتیش ہے، لیکن واقعے کی ہولناکی نے خطے بھر میں صدمہ، خوف اور غم وغصہ پھیلا دیا ہے۔

یہ کوئی پہلا سانحہ نہیں ہے۔ گلگت بلتستان میں ماضی میں بھی ایسے لرزہ خیز واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ حالیہ مہینوں میں دنیور کے ایک لڑکے کو بھی اسی نوعیت کے واقعے میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ خطہ آج بھی 2003 کے دل دہلا دینے والے واقعے کو یاد کرتا ہے، جب ایک طالب علم مسلم خان نے زیادتی کی کوشش سے بچنے کے لیے دریائے گلگت میں چھلانگ لگا دی تھی۔ 2015 میں حسنین نامی ایک کم سن بچے کو زیادتی کے بعد بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

یہ مسلسل واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ خطے میں بچوں کے ساتھ جنسی تشدد، بدسلوکی، استحصال اور تشدد ایک سنگین اور بے قابو مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔

2017 میں گلگت بلتستان اسمبلی نے چائلڈ پروٹیکشن ریسپانس ایکٹ منظور کیا اور ایک چائلڈ پروٹیکشن کمیشن قائم کیا گیا۔ لیکن حکومتی عدم دلچسپی، فنڈز کی کمی اور سیاسی عزم کی غیر موجودگی کے باعث یہ کمیشن آج تک فعال نہ ہو سکا۔ قانون کاغذوں میں موجود ضرور ہے لیکن عمل درآمد نہ ہونے کے باعث بچے شدید خطرات سے دوچار ہیں۔

رپورٹ ہونے والے واقعات سے ہٹ کر بھی گلگت بلتستان میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی، بدسلوکی ایک خاموش وبا کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ مقامی برادریاں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ یہ مسئلہ وسیع پیمانے پر موجود ہے، مگر زیادہ تر واقعات رپورٹ نہیں کیے جاتے۔ خاندان سماجی بدنامی، "برا نام" پڑنے کے ڈر اور قانونی تحفظ کے فقدان کے باعث اس وقت تک رپورٹ درج نہیں کرواتے جب تک معاملہ قتل تک نہ پہنچ جائے۔

گلگت بلتستان میں ایک خوفناک اصطلاح "بی کے (بکو ختار)" استعمال کی جاتی ہے جس کا مطلب ہے "لڑکوں کا چھرا" یا "وہ چھرا جو لڑکوں کے خلاف استعمال ہو"، جو دراصل بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح ایک اور لفظ "جانڈر" خوبصورت اور کشش رکھنے والے لڑکوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہیں زیادتی کرنے والے لوگ اپنا ممکنہ شکار سمجھتے ہیں۔ ایسے الفاظ کا رائج ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسئلہ کس قدر گہرا اور عام ہو چکا ہے۔

منشیات کا پھیلاؤ اس بحران کو مزید سنگین بنا رہا ہے۔ گلگت بلتستان میں بڑی تعداد میں نوجوان نشے کی عادت کا شکار ہو رہے ہیں، جس سے ان کے استحصال اور بدسلوکی کے امکانات مزید بڑھ جاتے ہیں۔ منشیات فروش اور جرائم پیشہ عناصر ایسے کمزور نوجوانوں کو نشانہ بناتے ہیں اور انہیں استحصال و تشدد کے چکر میں دھکیل دیتے ہیں۔

بچوں کے تحفظ پر کام کرنے والے لوگوں کا مطالبہ واضح ہے: اب بس بہت ہو گیا۔ بچوں کو ایسے گھناؤنے جرائم سے بچانے کے لیے فوری اور مضبوط اقدامات کی ضرورت ہے۔ ایک جامع چائلڈ پروٹیکشن نظام تیار کر کے سختی سے نافذ کیا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں چند اہم اقدامات درج ذیل ہیں:

گلگت بلتستان کے تمام اضلاع میں وسائل سے لیس اور تربیت یافتہ چائلڈ پروٹیکشن یونٹس قائم کیے جائیں جو بچاؤ، رپورٹنگ اور ردعمل کے عمل کو سنبھالیں۔

پولیس، سماجی بہبود، محکمہ صحت، اسکولوں، سول سوسائٹی اور عدلیہ کے درمیان مربوط تعاون یقینی بنایا جائے تاکہ بچوں کا ہمہ جہتی تحفظ ممکن ہو سکے۔

چائلڈ پروٹیکشن کمیشن کو فعال بنایا جائے اور سیاسی تاخیر یا بیوروکریٹک رکاوٹوں کے بغیر قانون پر عمل درآمد کیا جائے۔

کمیونٹیز کو بچوں کے حقوق، رپورٹنگ کے طریقہ کار اور بدسلوکی اور جنسی تشدد کے نتائج کے بارے میں آگاہ کیا جائے تاکہ خاموشی کا کلچر ٹوٹ سکے۔

منشیات کے عادی نوجوانوں کے لیے بحالی مراکز، کونسلنگ اور کمیونٹی پروگرام شروع کیے جائیں تاکہ ان کی کمزوریوں کا ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جا سکے۔

بچوں کے لیے دوستانہ رپورٹنگ اور تحفظ کے نظام وضع کیے جائیں تاکہ خاندان سماجی بدنامی یا انتقامی کارروائی کے خوف کے بجائے کھل کر رپورٹ درج کر سکیں۔

مجرموں کو فوری اور عبرتناک سزا دی جائے تاکہ آئندہ ایسے جرائم کی روک تھام ممکن ہو۔ نہ صرف بلکہ مجرموں کی بھی ذہنی صحت کی بحالی پر کام کیا جائے تاکہ وہ جیلوں سے نکل کر دوبارہ اس لعنت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

بچوں کا تحفظ صرف ریاست کی ذمہ داری نہیں بلکہ خاندانوں، برادری، سول سوسائٹی، میڈیا اور مذہبی اداروں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ جب تک بچوں کے ساتھ زیادتی کو ایک سنگین سماجی اور انسانی حقوق کے بحران کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا، یہ سانحات جاری رہیں گے۔

راجہ کاشان کا لرزہ خیز واقعہ ایک تلخ یاددہانی ہے کہ گلگت بلتستان مزید خاموشی، بے حسی یا کمزور ردعمل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مزید معصوم جانیں کھونے سے پہلے اب فوری اقدام ناگزیر ہے۔

کیا آلودگی ہماری آنے والی نسلوں کے لیے موت کا پیغام ہے؟

قیصرہ اکرام

انسان اور فطرت کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ یہ رشتہ یقیناً انسان کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ انسان کا فطرت سے اولین تعارف درختوں کے ذریعے ہوا۔

درختوں سے ملنے والی آکسیجن نے نہ صرف انسان کو سانسیں بخشیں بلکہ اسے پناہ، سایہ اور پھل بھی فراہم کیے اور اُس نے اس رشتے کو آج تک زندہ رکھا ہوا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں درختوں نے انسان کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے وہاں ندیوں اور دریاؤں نے انسانیت کی پیاس بجھائی اور زمین نے اناج دیا۔

ادب میں فطرت کو انسان کا رفیق کہا گیا ہے جیسے درختوں اور پانی کو حیات اور ہوا کو آزادی کا استعارہ بتایا گیا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ رشتہ کمزور ہوا ہے۔

کچھ تحقیقی مطالعے بتاتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں انسان اور فطرت کا دوطرفہ تعلق 60 فی صد کم ہوا ہے۔

ہم درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں، تروتازہ ہوا اور پرندوں کی چہچہاہٹ کی بجائے ایئر کنڈیشن اور مشینوں کی آوازوں کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارا فطرت کے ساتھ صرف جسمانی تعلق نہیں ٹوٹا بلکہ روحانی تعلق بھی ختم ہو گیا ہے۔

ہم نے اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لیے دریاؤں، سمندروں کو ناپا، زمین کو چیرا اور آسمان تک جا پہنچے۔ آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں کہ ترقی کا تصور ہمارے لیے ایک موذی مرض کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

ہم بظاہر تو اپنے لیے سہولتیں پیدا کر رہے ہیں لیکن اصل میں ہمارا ماحول اور صحت کا نظام بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔

آج ہماری ترقی کی تعریف بدل گئی ہے، ہم علم، سماجی رشتوں اور فطرت کے ساتھ تعلق کی بجائے مالز، سڑکوں اور ہائی رائز عمارتوں میں رہنے کو ترقی سمجھتے ہیں۔

وہ شہر جو کبھی باغوں، سبزے اور سمندری ہواؤں کا مسکن تھے، آج گرد و غبار، شور، ہر قسم کی آلودگی اور کنکریٹ کے جنگل میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

ہماری یہ مصنوعی ترقی درحقیقت ہماری اپنی اور زمین کی تباہی کی ایک دوڑ ہے جسے جیتنے میں ہم اپنی ساری توانائی خرچ کر رہے ہیں۔

ہم اگر کچھ تحقیقی حقائق کو دیکھیں تو عالمی ادارہ صحت کے مطابق 90 فیصد شہری آبادی آلودہ فضاء میں سانس لے رہی ہے۔



ہم اگر کچھ تحقیقی حقائق کو دیکھیں تو عالمی ادارہ صحت کے مطابق 90 فیصد شہری آبادی آلودہ فضا میں سانس لے رہی ہے



ہمیں شہری جنگلات لگانے چاہییں، ان سے شہروں میں جنگلی حیات لوٹ آئے گی

صرف پاکستان کی بات کریں تو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ فضائی آلودگی کے باعث موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

شہروں کا درجہ حرارت ہر سال بڑھ رہا ہے اور ایک اندازے کے مطابق درجہ حرارت میں ہر سال اوسطاً دو سینٹی گریڈ کا اضافہ ہو رہا ہے۔

بارشوں کے غیر متوازن ہونے کی وجہ سے تباہ کن سیلابی ریلوں کا آنا، کلاؤڈ برسٹ، زیرِ زمین پانی کی سطح کا کام اور آلودہ ہونا، خشک سالی کا بڑھنا، سب اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم نہ صرف اپنے ساتھ موت کا کھیل کھیل رہے ہیں بلکہ باقی زمینی حیات پر بھی زندگی کو تنگ کر رہے ہیں۔

یہ مصنوعی ترقی ہماری جسمانی اور ذہنی صحت کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ دمہ اور الرجی جیسی بیماریاں عام ہو رہی ہیں۔

پھیپھڑوں کے امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کینسر کی بیماری عام ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ ذہنی دباؤ اور ڈپریشن کا شکار ہو رہے ہیں جو درحقیقت فطرت سے دوری کا نتیجہ ہے۔

ہم زمین کی زرخیزی کی بات کریں تو وہ ہر دن کم ہو رہی ہے۔ جنگلی حیات کم ہوتی جا رہی ہیں۔ جانوروں اور پرندوں کی بہت سی اقسام معدوم ہو چکی ہیں، بعض ہونے کے قریب ہیں۔

دریاؤں، ندی نالوں اور جھیلوں کا پانی آلودہ ہو چکا ہے۔ موسم اس قدر غیر متوازن ہو چکے ہیں کہ یا تو اچانک سے سیلاب آ جاتے ہیں یا پھر خشک سالی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم اگر اپنی ترقی کی تعریف کو بدل لیں، فطرت کے ساتھ اپنے تعلق کو بحال کر لیں اور پھر سے وہی توازن برقرار ہو جائے تو بہتری کے امکان پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہمیں شہری جنگلات لگانے چاہییں جیسے کہ میاواکی فارسٹس، ان سے شہروں میں جنگلی حیات لوٹ آئے گی جن کو ہم نے بے دخل کر رکھا ہے اور قدرتی ایکو سسٹم بحال ہو گا۔

پالیسی کی سطح پر سسٹین ایبل ڈویلپمنٹ کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو ترقی کرنے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ اپنی نئی نسلوں میں فطرت کے ساتھ تعلق کو پروان چڑھائیں، تعلیم کے ذریعے ان میں یہ شعور اجاگر کریں کہ فطرت کے ساتھ رشتہ جتنا مضبوط ہو گا ہم اتنے ہی سکون میں رہیں گے۔

پاکستان سیلاب: ہزار سے زیادہ ہلاکتیں، 25 لاکھ افراد بے گھر



17 ستمبر 2025 انسانی امداد

پاکستان میں آنے والے شدید سیلاب کے بعد متاثرہ علاقوں میں بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیوں کی ضرورت ہے جہاں لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے ہیں، اہم فصلیں تباہ ہو چکی ہیں اور بدحال لوگوں کی زندگی تباہی کے دھانے پر ہے۔ جون کے اواخر سے شروع ہونے والی مون سون کی غیر معمولی شدید بارشوں سے آنے والے اچانک سیلاب اور پہاڑی تودے گرنے کے واقعات میں 1,000 سے زیادہ لوگ ہلاک ہوئے ہیں جن میں ایک چوتھائی تعداد بچوں کی ہے۔ اس آفت سے اب تک مجموعی طور پر 60 لاکھ سے زیادہ لوگ کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں بے گھر ہونے والے 25 لاکھ لوگ سرکاری پناہ گاہوں میں یا اپنے رشتہ داروں کے ہاں مقیم ہیں جن کے وسائل پر پہلے ہی بہت بڑا بوجھ ہے۔ پاکستان میں اقوام متحدہ کے امدادی رابطہ دفتر (اوچا) کے نمائندے کارلوس گیہا نے یو این نیوز کو بتایا ہے کہ سیلاب کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے بہت سے لوگ تا حال اپنے علاقوں میں واپس نہیں آ سکے جبکہ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے گھر اور کاروبار تباہ ہو گئے ہیں۔

لاکھوں زندگیاں متاثر

صوبہ پنجاب کے دریاؤں میں آنے والے سیلاب نے مون سون کی شدید بارشوں کے باعث پیدا ہونے والی صورتحال کو مزید خراب کر دیا ہے۔ دریائے ستلج، راوی اور چناب میں سیلاب کے نتیجے میں بہت سے علاقے زیر آب آ گئے ہیں۔ زرعی اعتبار سے پنجاب ملک کا اہم ترین صوبہ ہے جہاں انڈیا کی جانب سے ان دریاؤں میں پانی چھوڑے جانے سے 47 لاکھ لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں سیلاب سے 16 لاکھ افراد متاثر ہوئے جبکہ گلگت بلتستان کے کئی علاقے گلیشیئر جھیلوں کے پھٹنے سے آنے والے اچانک سیلاب کی زد میں آ کر تباہ ہو چکے ہیں اور کئی وادیاں دیگر علاقوں سے مکمل طور پر کٹ گئی ہیں۔ صوبہ سندھ میں بھی بہت بڑے پیمانے پر سیلاب کے خطرے کے پیش نظر ہائی الرٹ جاری کر دیا گیا ہے۔ کارلوس گیہا نے کہا ہے کہ سیلاب سے قبل حکومت نے 25 لاکھ افراد کی محفوظ علاقوں میں منتقلی کے لیے بہت عمدہ کام کیا جو 2022 میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ لیکن جب پانی کی سطح 25 فٹ تک پہنچ جائے اور یہ پورے کے پورے دیہات نگل لے تو پھر حفاظتی اقدامات کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔

زراعت اور بنیادی ڈھانچے کی تباہی

قدرتی آفات سے بچاؤ کے قومی ادارے (این ڈی ایم اے) کے مطابق، حالیہ سیلاب میں کم از کم 8,400 سے زیادہ مکانات، 239 پُلوں اور تقریباً 700 کلومیٹر سڑکوں کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ 22 لاکھ ہیکٹر سے زیادہ زرعی اراضی زیر آب آ چکی ہے جس کا بڑا حصہ پنجاب میں واقع ہے۔ ایسے علاقوں میں فصلیں تباہ ہو گئی ہیں اور خوراک کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں صرف گندم کے آٹے کی قیمتیں ہی 25 فیصد بڑھ گئی تھیں۔ کارلوس گیہا کا کہنا ہے کہ یہ وہ کسان خاندان ہیں جو پورے ملک کو خوراک مہیا کرتے ہیں۔ اب ان کی زمین زیر آب ہے، مویشی ہلاک ہو چکے ہیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔

امدادی کارروائیوں پر بوجھ

اقوام متحدہ اور اس کے شراکت دار اس تباہی کی شدت کے مطابق امداد فراہم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اقوام متحدہ کے مرکزی ہنگامی امدادی فنڈ (سی ای آر ایف) سے 50 لاکھ ڈالر جاری کیے گئے ہیں، جب کہ اضافی 15 لاکھ ڈالر مقامی غیر سرکاری تنظیموں کو فراہم کیے گئے ہیں۔ یونیسف، عالمی خوراک پروگرام (ڈبلیو ایف پی) اور دیگر ادارے صاف پانی کی ترسیل، صحت و غذائیت کی فراہمی اور بچوں کے لیے عارضی تعلیمی مراکز قائم کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ تاہم، امدادی اداروں کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ ناکافی ہے۔ ٹوٹے پلوں اور زیر آب سڑکوں کی وجہ سے کئی علاقے اب بھی ناقابل رسائی ہیں جہاں خوراک اور ادویات صرف کشتیوں یا ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہی پہنچائی جا سکتی ہیں۔ سیلاب زدہ علاقوں میں ملیریا اور ڈینگی سمیت پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں بڑھ رہی ہیں، اور آئندہ ہفتوں میں ہیضہ پھیلنے کا خدشہ ہے۔ کارلوس گیہا کا کہنا ہے کہ خوراک، صحت کی سہولیات، پناہ کا سامان، صاف پانی اور صحت و صفائی کا انتظام لوگوں کی بنیادی ضرورت ہیں۔ تاہم، اس کے بعد سیلاب متاثرین کو بحالی میں مدد دینا ہوگی جو اس سے کہیں بڑا اور مشکل کام ہوگا۔

پاکستان کے ساتھ یکجہتی کی ضرورت

پاکستان نے حالیہ برسوں میں 2022 کے ریکارڈ توڑ سیلاب سے لے کر شدید گرمی کی لہروں اور خشک سالی تک ایک کے بعد ایک موسمیاتی آفت کا سامنا کیا ہے اور ہر نیا دھچکا پہلے سے کمزور خاندانوں کو مزید غربت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ کارلوس گیہا کا کہنا ہے کہ اس میں پاکستان کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس کا شمار ایسے ممالک میں ہوتا ہے جو موسمیاتی تبدیلی سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں جبکہ یہ مسئلہ پیدا کرنے میں ان کا بہت کم کردار ہے۔ عالمی برادری کو چاہیے کہ وہ صرف اس ہنگامی صورتحال میں ہی نہیں بلکہ طویل المدتی بنیاد پر پاکستان کے ساتھ کھڑی ہو اور اسے بحالی و خود انحصاری میں مدد دے۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

تیراہ میں غیرت کے نام پر گھروں کی مسماری اور قتل

خیبر فاٹا انضمام کے بعد قبائلی اضلاع میں مشترکہ ذمہ داری اور گھروں کی مسماری جیسی روایات کے خاتمے کے دعوے کیے گئے تھے، کیونکہ اب یہاں عدالتیں اور پولیس سسٹم موجود ہیں۔ تاہم زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ ضلع خیبر کی وادی تیراہ میں چند ہفتے قبل ایک لڑکے اور لڑکی کی مبینہ طور پر غیر اخلاقی ویڈیوز سامنے آنے کے بعد مقامی مشران نے ان کے پورے گھروں کو جلا کر مسمار کر دیا ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ نہ تو ضلعی عدالت نے اس معاملے پر کوئی نوٹس لیا اور نہ ہی ڈی پی او خیبر کی جانب سے ایف آئی آر درج کی گئی۔ ذرائع کے مطابق، مقامی مشران کے فیصلے کے بعد آج لڑکے اور لڑکی دونوں کو غیرت کے نام پر قتل بھی کر دیا گیا ہے۔ تاہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ لڑکے کے ولڑکی کی سزا گھروں والوں کو کیوں دی گئی اور گھر کیو مسمار کیئے گئے؟ ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ اگر چہ لڑکے اور لڑکی سے غلطی سرزد ہوئی ہوگی، لیکن اس کی سزا پورے خاندان کو دینا نہ اسلام میں جائز ہے اور نہ ہی آئین و قانون پاکستان اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان کے مطابق ڈی پی او خیبر کی جانب سے اس معاملے پر تا حال کوئی کارروائی نہ کرنا اور ایف آئی آر درج نہ کرنا خود ایک سنگین غفلت ہے، جس پر اعلیٰ سطحی تحقیقات ہونی چاہئیں۔ اس حوالے سے پولیس کا موقف جاننے کی کوشش کی گئی تو ان کی جانب سے کوئی حوصلہ افزاء جواب نہ مل سکا۔ سوالات یہ جنم لیتے ہیں کہ کس آئین، کس قانون اور کس شریعت میں لکھا گیا ہے کہ دو افراد کے جرم کی وجہ سے ان کے پورے خاندان کو سزا دی جائے اور انکے ہنستے بستے گھر کو مسمار کیا جائے۔ اگر آئین پاکستان، قانون پاکستان اور شریعت میں اس کا حکم نہیں ہے تو پھر عدالت کیو خاموش ہے، خیبر پولیس وضلعی انتظامیہ کیو خاموش ہے اور علمائے کرام کیو خاموش ہیں۔ (منظور آفریدی)

اسامیاں خالی ہیں

نوشکی نوشکی میں گزشتہ پانچ ماہ سے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر ریونیو اور دو ماہ سے اسٹنٹ کمشنر نوشکی کی آسامی خالی ہے۔ اہم انتظامی آسامیاں خالی ہونے سے شہریوں کو اپنے دفتری امور کے سلسلے میں دشواریوں، مالی مصائب اور وقت کے ضیاع سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ طلباء اور طالبات کو لوکل سرٹیفکیٹ انکم سرٹیفکیٹ کے حصول میں مشکلات پیش آ رہی ہے اہم انتظامی پوسٹ خالی ہونے کی وجہ سے ضلعی حکومت کی کارکردگی پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں پرائس کنٹرول کمیٹی غیر فعال ہونے کی وجہ سے مہنگائی میں اضافے سے غریب عوام کے مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے مہینوں سے انتظامی آفیسران کی عدم تعیناتی صوبائی حکومت کی کارکردگی پر بھی سوالیہ نشان ہے عوام کے مشکلات دشواریوں وقت کے ضیاع اور مالی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے نوشکی میں ترجیحی بنیادوں پر ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر ریونیو اور اسٹنٹ کمشنر کی خالی آسامیوں پر تقرریاں عمل میں لانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ (محمد سعید)

امن کمیٹی رضا کار اغواء کے بعد قتل، لاش بازار کے قریب پھینک دی گئی

وادی تیرہ واقعات کے مطابق امن کمیٹی لشکر جنود الخیبر کے رضا کار کو اغواء کے بعد فائرنگ کر کے قتل کر دیا گیا، لاش قریبی علاقے میں پھینکنے سے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ مقامی ذرائع کے مطابق گزشتہ روز شام تقریباً سات بجے تھانہ وادی تیراہ کی حدود میں واقع ملک دین خیل کے علاقے شمشے کلی سے امن کمیٹی جنود الخیبر کے رضا کار زوتا خان ولد ضمیر خان کو مبینہ طور پر کالعدم تحریک طالبان کے مقامی کمانڈر کے ساتھیوں نے گھر سے اغواء کیا۔ ذرائع کے مطابق آج صبح مسلح افراد نے مغوی رضا کار زوتا خان کو گولی مار کر قتل کر دیا اور اس کی لاش 27 بریگیڈ کے انڈر کمانڈ علاقے بر باغ بازار کے داخلی راستے میں پل کے نیچے پھینک دی۔ مقامی افراد نے لاش دیکھ کر حکام کو اطلاع دی جس کے بعد علاقے میں شدید خوف و ہراس کی فضا قائم ہوگئی۔ (مسعود شاہ)

بیروزگاری میں مسلسل اضافہ

نوشکی قدرتی وسائل سے مالا مال جغرافیائی اعتبار سے اہمیت کے حامل رخشان ڈویژن کے ڈسٹرکٹ نوشکی میں بیروزگاری کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے محکمہ زراعت میں گریڈ 1 کے راڈ مین نائب قاصد اور چوکیدار کے فور کلاس کے تین آسامیوں کے لیے 473 امیدواروں نے کاغذات جمع کرانے ہیں جن میں ایم اے اور بی اے پاس امیدواروں کی بڑی تعداد بھی شامل ہے ڈویژنل ڈائریکٹر شہزاد احمد ڈپٹی ڈائریکٹر زراعت صاحبزاد ثناء اللہ نے امیدواروں کے انٹرویو لیے بیروزگاری کے خاتمے کے لیے حکومت سرحدی ٹریڈ کو فروغ دینے پاک افغان بارڈر پر واقع گزنلی زیرو پوائنٹ جو 2005 میں پاک افغان ٹریڈ کے لیے بنایا گیا تھا 20 سال کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ہنوز غیر فعال ہے گزنلی زیرو پوائنٹ سے پاک افغان ٹریڈ کو فروغ دونوں برادر ممالک میں تعلقات مستحکم بارڈر ٹریڈ سے نوشکی میں ترقی خوشحالی کی نئی راہیں کھولنے سے ترقی اور خوشحالی کا نیا دور شروع ہوگا۔ وفاقی حکومت اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرے۔ (محمد سعید)

تنخواہوں کی عدم ادائیگی

نوشکی بلوچستان کے دیگر اضلاع کی طرح نوشکی میں بھی بلدیاتی اداروں کے ملازمین اور لیبر کی تین ماہ سے تنخواہوں کی عدم ادائیگی اور گرانٹ کی بندش کے خلاف میونسپل کمیٹی نوشکی میں بھی دفاتر میں تالہ بندی اور دفاتر میں کام بطور احتجاج چھوڑ دیا ہے جسکی وجہ سے شہریوں کو اپنے مسائل کے سلسلے میں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ صوبائی حکومت عوام کی مشکلات اور بلدیاتی اداروں کے ملازمین اور لیبر کے مالی مصائب کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجیحی بنیادوں پر تنخواہوں کی ادائیگی اور گرانٹ کی فراہمی کے لیے اقدامات کریں۔ تنخواہوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے اس مہنگائی کے دور میں انتہائی اور مالی مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ملازمین کی ہڑتال کی وجہ سے شہر میں صفائی کی صورت سے شہری پریشان ہیں۔

(محمد سعید)

گولہ گرنے سے 23 افراد جاں بحق

خیبر ضلع خیبر کی تحصیل باڑہ کے علاقے تیراہ آکاخیل میں شاڈلہ کے قریب مترے درہ میں 22 ستمبر کو رات گئے نامعلوم سمت سے ایک گولہ آ کر گرا جس کے نتیجے میں کم از کم 23 افراد جاں بحق ہو گئے جن میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں۔ عینی شاہدین کی رپورٹ کے مطابق متعدد افراد کے زخمی ہونے کی بھی اطلاعات موصول ہوئی ہیں جبکہ واقعے میں 5 مکانات مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ حادثے کے بعد مقامی افراد نے امدادی کارروائیاں شروع کر دیں اور اپنی مدد آپ کے تحت ملبے تلے دبے زخمیوں اور لاشوں کو نکالنے میں مصروف ہیں۔ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ہلاکتوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے کیونکہ کئی افراد تا حال ملبے تلے دبے ہوئے ہیں۔ مقامی ذرائع کے مطابق جاں بحق افراد کی میتیں شاڈلہ میں جمع کر دی گئی ہیں جہاں بڑی تعداد میں اہل علاقہ جمع ہو چکے ہیں اور فضا سوگوار ہے۔ تحصیل باڑہ کے چیئرمین مفتی کفیل آفریدی نے واقعے کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ یہ سانحہ رات تقریباً دو بجے پیش آیا، جس میں تین گھر مکمل طور پر منہدم ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ جاں بحق افراد میں خواتین اور بچے بھی شامل ہیں جو انتہائی افسوسناک ہے۔ ادھر علاقے کے لوگوں اور بارہ سیاسی اتحاد نے واقعے پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ متاثرہ خاندانوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور ہر ممکن امداد کی یقین دہانی کراتے ہیں۔ (منظور آفریدی)

عورتیں

خواتین آبادی کا نصف لیکن خبروں میں نمائندگی ایک چوتھائی، رپورٹ

ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اخبارات میں آنے والی صرف 26 فیصد خبریں خواتین سے متعلق ہوتی ہیں۔ صنفی تشدد شاذ و نادر ہی خبروں میں جگہ پاتا ہے اور 100 میں دو سے بھی کم خبریں اس بدسلوکی کے بارے میں ہوتی ہیں جن کا بہت سی خواتین کو روزمرہ زندگی میں متواتر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خواتین کے لیے اقوام متحدہ کے ادارے 'یو این ویمن' کے تعاون سے جاری ہونے والی تازہ ترین رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صرف دو فیصد خبروں میں ہی خواتین کے حوالے سے دقیانوسی تصورات کے خلاف واضح بات سننے کو ملتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ خواتین مخالف تعصبات کو مضبوط کرتے ہیں اور صنفی مساوات کی راہ میں بدستور رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ جائزہ ورلڈ ایسوسی ایشن آف کرسچین کمیونیکیشن (ڈبلیو اے سی سی) کے زیر اہتمام عالمگیر ذرائع ابلاغ کی نگرانی کے منصوبے کی تازہ ترین اشاعت ہے جس میں خواتین پر تشدد کے خاتمے سے متعلق 'یو این ویمن' کے پروگرام نے بھی معاونت فراہم کی ہے۔ جائزہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ خواتین دنیا کی آبادی کا نصف ہیں لیکن خبروں میں ان کی نمائندگی صرف ایک چوتھائی ہوتی ہے۔

ادھوری خبر، نامکمل جمہوریت

'یو این ویمن' کی نائب ایگزیکٹو ڈائریکٹر کیرسی میڈی نے کہا ہے کہ جب خواتین کو نمائندگی نہیں ملتی تو جمہوریت نامکمل رہتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کو صنفی مساوات کے فروغ میں اپنے کردار کی تکمیل کے قابل بنانے کے لیے بنیادی سوچ کو تبدیل کرنا ہوگا۔ خواتین کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی، کوئی جمہوریت منصفانہ نہیں ہوتی، کوئی تحفظ پائیدار نہیں ہوتا اور کوئی مشترکہ مستقبل وجود نہیں رکھتا۔ جائزے سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ زیادہ تر خواتین صحافی ہی خواتین کے بارے میں خبریں (29 فیصد) دیتی ہیں جبکہ مرد صحافیوں کی خبروں میں یہ شرح 24 فیصد ہوتی ہے۔ کیرسی میڈی نے کہا ہے کہ ہر نیوز روم اور ہر خبر میں خواتین کو نمائندگی ملنے تک 'یو این ویمن' اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

میڈیکل رپورٹ میں لڑکی نابالغ ثابت، کیس درج

تحصیل کنری کے گوٹھ سانون خان رند کے رہواسی ایسرو ولد پدموں بھیل نے ایڈیشنل سیشن جج عمرکوٹ کے حکم پر وومین پولیس تھانہ عمرکوٹ پر اپنی بیٹی مرگھاں کی شادی کا کیس گناہ نمبر 38/2025 قلم 3,4,5 Sindh Child marriage Act 2013 کے تحت ملزم حب علی ولد الھڈ نو رند، نکاح خواں مولوی عتیق حسن قاری سمیت نکاح میں شامل دو شاہدوں کے خلاف درج کراتے ہوئے مؤقف اختیار کیا کہ کورات کو ساڑھے دس بجے ملزم حب علی نے ہمارے گھر میں گھس کر پسٹل کے زور پر میری 15/16 سالا نابالغ بچی مرگھاں کو اغوا کر کے تبدیلی مذہب کے بعد شادی کر لی۔ لڑکی کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ جس پر والد نے ایڈیشنل سیشن جج عمرکوٹ کی عدالت میں بچی کے اغوا اور چھوٹی عمر میں شادی کے متعلق درخواست دی۔ عدالت کے حکم پر پولیس نے مبینا مغویہ لڑکی مرگھاں (فاطمہ) کو ہاتھ کر کے مذکورہ عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے لڑکی کی میڈیکل کرانے اور دارالامان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ بچی کی کرائی گئی میڈیکل میں بچی کی عمر "16" برس ثابت ہوئی۔ جس کے بعد مزکورہ عدالت نے جوابدار دولہا حب علی ولد الھڈ نو رند، نکاح خواں ملاں عتیق حسن قاری سمیت نکاح میں شامل دو شاہدوں کے خلاف کیس درج کرنے کا حکم دیا تھا۔ نابالغ لڑکی مرگھاں کو پولیس نے دارالامان سے لے جا کر سول جج ون عمرکوٹ کی عدالت میں پیش کیا۔ جہاں مذکورہ لڑکی نے اپنے والدین کے ساتھ جانے کا بیان دیا۔ جس کے بعد عدالت نے لڑکی مرگھاں کو والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ (نامہ نگار)

ادھوری خبر، نامکمل جمہوریت

'یو این ویمن' کی نائب ایگزیکٹو ڈائریکٹر کیرسی میڈی نے کہا ہے کہ جب خواتین کو نمائندگی نہیں ملتی تو جمہوریت نامکمل رہتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کو صنفی مساوات کے فروغ میں اپنے کردار کی تکمیل کے قابل بنانے کے لیے بنیادی سوچ کو تبدیل کرنا ہو گا۔ خواتین کے بغیر کوئی کہانی مکمل نہیں ہوتی، کوئی جمہوریت منصفانہ نہیں ہوتی، کوئی تحفظ پائیدار نہیں ہوتا اور کوئی مشترکہ مستقبل وجود نہیں رکھتا۔ جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملے میں پریشان کن صورتحال کے باوجود بعض شعبوں میں بہتری بھی دیکھنے کو ملی ہے۔ مثال کے طور پر، اب روایتی خبریں دینے والے صحافیوں میں 41 فیصد تعداد خواتین کی ہے جبکہ 1995 میں یہ شرح 28 فیصد تھی۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ زیادہ تر خواتین صحافی ہی خواتین کے بارے میں خبریں (29 فیصد) دیتی ہیں جبکہ مرد صحافیوں کی خبروں میں یہ شرح 24 فیصد ہوتی ہے۔ کیرسی میڈی نے کہا ہے کہ ہر نیوز روم اور ہر خبر میں خواتین کو نمائندگی ملنے تک 'یو این ویمن' اپنی جدوجہد جاری رکھے گا۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

میڈیکل رپورٹ میں لڑکی نابالغ ثابت، کیس درج

یکم اگست کو تحصیل کنری کے گوٹھ سانون خان رند کے رہواسی ایسرو ولد پدموں بھیل نے ایڈیشنل سیشن جج عمرکوٹ کے حکم پر وومین پولیس تھانہ عمرکوٹ پر اپنی بیٹی مرگھاں کی شادی کا کیس گناہ نمبر 38/2025 قلم 3,4,5 Sindh Child marriage Act 2013 کے تحت ملزم حب علی ولد الھڈ نو رند، نکاح خواں مولوی عتیق حسن قاری سمیت نکاح میں شامل دو شاہدوں کے خلاف درج کراتے ہوئے مؤقف اختیار کیا کہ رات کو ساڑھے دس بجے ملزم حب علی نے ہمارے گھر میں گھس کر پسٹل کے زور پر میری 15/16 سالا نابالغ بچی مرگھاں کو اغوا کر کے تبدیلی مذہب کے بعد شادی کر لی۔ لڑکی کا نام فاطمہ رکھا گیا۔ جس پر والد نے ایڈیشنل سیشن جج عمرکوٹ کی عدالت میں بچی کے اغوا اور چھوٹی عمر میں شادی کے متعلق درخواست دی۔ عدالت کے حکم پر پولیس نے مبینا مغویہ لڑکی مرگھاں (فاطمہ) کو ہاتھ کر کے مذکورہ عدالت میں پیش کیا۔ عدالت نے لڑکی کی میڈیکل کرانے اور دارالامان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ بچی کی کرائی گئی میڈیکل میں بچی کی عمر "16" برس ثابت ہوئی۔ جس کے بعد مذکورہ عدالت نے جوابدار دولہا حب علی ولد الھڈ نو رند، نکاح خواں ملاں عتیق حسن قاری سمیت نکاح میں شامل دو شاہدوں کے خلاف کیس درج کرنے کا حکم دیا تھا۔ نابالغ لڑکی مرگھاں کو پولیس نے دارالامان سے لے جا کر سول جج ون عمرکوٹ کی عدالت میں پیش کیا۔ جہاں مذکورہ لڑکی نے اپنے والدین کے ساتھ جانے کا بیان دیا۔ جس کے بعد عدالت نے لڑکی مرگھاں کو والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

(نامہ نگار)

تعلیم

پاکستان: وسیم کی کہانی جسے تعلیمی غربت کے اندھیرے میں ملی روشنی

---- پنجاب کے ضلع لودھراں کے ایک چھوٹے سے گاؤں سردار والا میں سات سالہ محمد وسیم اپنی صبحیں کھیتوں میں اور دن جھلستی دھوپ تلے اپنے ننھے ہاتھوں سے گھاس پھوس اکھاڑتے ہوئے گزارتا تھا۔ اس کی ماں، پھوپھی اور چچی بھی اس کے ساتھ کام کرتیں کیونکہ اس کے والد کی رکشہ چلانے سے حاصل ہونے والی آمدنی سے گھر کا گزارا مشکل تھا۔ کام کے دوران وسیم اکثر گاؤں کے دوسرے بچوں کو رنگ برنگے بستے اور پینسلوں کی تھیلی اٹھائے ہوئے خوشی خوشی سکول جاتے دیکھتا۔ اگرچہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کلاسوں میں کیا پڑھایا جاتا ہے، لیکن ان کے چہروں کی مسکراہٹ دیکھ کر اس کا دل چاہتا تھا کہ کاش وہ بھی ان میں شامل ہوتا۔ بدقسمتی سے اس کے والدین اسے سکول بھیجنے کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کتابوں اور یونیفارم کے لیے پیسے نہیں تھے، اور نہ ہی انہیں یہ یقین تھا کہ تعلیم کچھ بدل سکتی ہے۔ یوں وسیم کے خواب ادھورے چلے آ رہے تھے۔ لیکن عظمیٰ نامی ایک استاد کیا اس کیگھر آنے سے سب بدل گیا۔ اُس نے صرف دروازہ نہیں ہی کھٹکھٹایا بلکہ وسیم کے لیے ایک نئے مستقبل کا دروازہ کھول دیا۔ عظمیٰ اور ان کی ساتھی اساتذہ نے وسیم کے والدین کو سمجھایا کہ تعلیم کس طرح وسیم کے لیے بہتر زندگی کے مواقع پیدا کر سکتی ہے، اور ان کی مخلصانہ گفتگو وسیم کے والدین کے دلوں پر اثر کر گئی۔ اب وسیم جب ہر صبح جلدی اٹھتا ہے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ پروگرام کی جانب سے دی گئی اپنی کتابیں اور رنگین پنسلیں ہاتھ میں تھامے وہ خوشی خوشی سکول کا رخ کرتا ہے۔ بنیادی ریاضی کے ساتھ ساتھ وہ اردو اور انگریزی پڑھنا اور لکھنا سیکھ رہا ہے۔ وہ نئے دوستوں سے مل رہا ہے اور اس میں خود اعتمادی بڑھ رہی ہے۔ پنجاب بھر میں گلوبل پارٹنرشپ فار ایجوکیشن (جی پی ای) کے تعاون سے یونیسیف کے زیرِ انتظام "تعلیم پروگرام" جاری ہے، جو ان بچوں کی مدد کرتا ہے جو کبھی سکول نہیں گئے یا تعلیم میں کافی پیچھے رہ گئے ہیں۔

خوابوں کی تعبیر

12 اضلاع میں 14 ہزار سے زیادہ سرگرمیوں پر مبنی تعلیمی کیمپ لگائے گئے ہیں۔ جو تقریباً 4 لاکھ 45 ہزار بچوں کو دوبارہ پڑھنے اور کلاس میں اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع دے رہے ہیں، ان بچوں میں نصف تعداد لڑکیوں کی ہے۔ ان میں سے تقریباً 95 ہزار بچے کبھی سکول نہیں گئے تھے یا سکول چھوڑ چکے تھے، جو اب پہلی بار یا دوبارہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایسے پروگراموں کی بدولت ناممکن خواب شرمندہ تعبیر ہو رہے ہیں۔ وسیم اب کھیتوں میں کام نہیں کرتا۔ سکول سے واپس آ کر وہ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا ہے اور اپنی چھوٹی بہن اور خاندان کے دوسرے بچوں کو وہ سب کچھ سکھاتا ہے جو وہ سکول میں سیکھتا ہے۔ پنجاب کے کئی سکولوں میں بچے تو موجود ہیں لیکن حقیقت میں وہ کچھ سیکھ نہیں رہے۔ عالمی بینک کے "لرننگ پاورٹی" یعنی علمی غربت جائزے کے مطابق پنجاب میں داخلہ لینے والے 65 فیصد بچے دس برس کی عمر تک سادہ متن بھی پڑھ یا سمجھ نہیں پاتے۔

تعلیمی غربت کا حل

چھوٹے بچوں کے لیے یہ مشکل اس سے بھی پہلے شروع ہو جاتی ہے، کیونکہ تین سے پانچ سال کی عمر کے صرف 17 فیصد بچے ہی ابتدائے بچپن کی تعلیم حاصل کر پاتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار تعلیمی غربت کے بحران کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تاہم صورتحال اب بدل رہی ہے۔ یہ کامیابی کی محض ایک کہانی نہیں بلکہ اس بات کی تصدیق ہے کہ تعلیم میں سرمایہ کاری سے کیا کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔ گلوبل پارٹنرشپ فار ایجوکیشن کی مدد سے موسم گرما میں منعقد ہونے والے بنیادی تعلیمی کیمپ (ایف ایل این) وسیم جیسے بچوں کو خواب دیکھنے، آگے بڑھنے اور بہتر مستقبل بنانے کا ایک حقیقی موقع فراہم کر رہے ہیں۔ لیکن اب بھی وسیم کی طرح بہت سے بچے ان کھیتوں، گلیوں اور گھروں میں انتظار کر رہے ہیں جہاں کتابوں تک رسائی ممکن نہیں۔ مسلسل تعاون سے ان بچوں تک بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ ایف ایل این کیمپوں کے ذریعے صرف "ایک پنسل، ایک کتاب اور ایک خواب کے ساتھ" انہیں دوبارہ تعلیم کے سفر میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

(بشکریہ یو این خبرنامہ)

سیلاب سے 3 ہزار سے زائد سکول متاثر

------ صوبہ پنجاب میں تباہ کن سیلاب کے باعث 3 ہزار سے زائد اسکول غیر فعال ہو گئے، جس سے ہزاروں بچوں کا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگ گیا۔ ڈان اخبار میں شائع رپورٹ کے مطابق پنجاب کے وزیر برائے اسکول ایجوکیشن رانا سکندر حیات نے جمعرات کو کہا کہ سیلاب کے باعث 3 ہزار اسکول تباہ ہو چکے ہیں، جس سے ہزاروں طلبہ کی تعلیم شدید متاثر ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے اطفال (یونیسیف) کی نمائندہ برائے پاکستان پرنیلے آئرنسائیڈ سے ملاقات کے دوران رانا سکندر حیات گفتگو کر رہے تھے جس میں مختلف تعلیمی منصوبوں پر پیشرفت کا جائزہ لیا گیا۔ اجلاس میں بہتر نتائج کے لیے تعاون کو مزید مستحکم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ صوبائی وزیر نے یونیسف کی نمائندہ کو بتایا کہ صوبے میں سیلاب کی وجہ سے محکمہ اسکول ایجوکیشن کو بڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے ہی سہولیات کی کمی تھی لیکن آفت نے ہزاروں اسکول تباہ کر دیے، جن میں سے کئی اب بھی پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ محکمہ اب ان اسکولوں کی بحالی کے چیلنج سے دوچار ہے اور بے گھر طلبہ کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے فعال اسکولوں میں تین شفٹوں کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ پنجاب کے وزیر برائے اسکول ایجوکیشن نے کہا کہ متاثرہ اسکولوں کی بحالی میں تقریباً تین ماہ لگیں گے، اس دوران حکومت نے منصوبہ بنایا ہے کہ نجی عمارتیں کرائے پر لی جائیں اور متاثرہ علاقوں میں خیمہ اسکول قائم کیے جائیں۔

کئی دیہات زیرِ آب

دوسری جانب سرکاری دعووں کے باوجود کہ پنجاب بھر میں سیلابی پانی کم ہو رہا ہے، دریائے ستلج پر نوراجا بھٹہ کے بند میں تین شگاف پڑنے سے تباہ کن جھیلیں بن گئی ہیں جنہوں نے ملتان، لودھراں اور بہاولپور کے کئی دیہات کو ایک ہفتے سے زائد عرصے سے ڈبو رکھا ہے۔ الطاف لنگ کا کہنا تھا کہ موٹروے ویسے بھی ٹریفک کے لیے استعمال کے قابل نہیں رہی، حکام کو چاہیے کہ اسے توڑ کر پانی کا اخراج ممکن بنائیں، موجودہ کلورٹس پانی کے گزر کے لیے نہیں بنے بلکہ صرف مقامی افراد اور مویشیوں کے گزرنے کے لیے ہیں اور وہ بھی مکمل طور پر بند ہو چکے ہیں۔ نیشنل ہائی وے اتھارٹی (این ایچ اے) کے جنرل منیجر کاشف نواز نے 'ڈان' کو بتایا کہ موٹروے توڑنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پانی نیچے کلورٹس سے گزر رہا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ کمزور مقامات کو مضبوط کرنے کے لیے پتھر رکھے جا رہے ہیں تاکہ موٹروے محفوظ رہے، البتہ کلورٹس بند نہیں کیے گئے۔ (بشکریہ ڈان)

صحت

بہاولپور میں دریائے ستلج کی تباہ کاریاں

بہاولپور دریائے ستلج ہندوستان کے علاقہ ہماچل پردیش سے شروع ہوتا ہے اور بھارتی پنجاب کے کئی اضلاع میں بہتا ہوا 1020 کلومیٹر کا سفر کر کے پاکستان کے صوبہ پنجاب کے اضلاع قصور، اوکاڑہ، پاکپتن، وہاڑی، بہاولنگر اور بہاولپور کے علاقہ ہیڈ پنجند تک 540 کلومیٹر کا سفر کر کے دیگر دریاؤں میں ضم ہوتا ہے۔ متواتر موسمیاتی تبدیلی کے باعث رواں برس دنیا بھر میں پہلے سے زیادہ خشک سالی، شدید گرمی کی لہریں اور سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھنے میں آئیں جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ ڈسٹرکٹ بہاولپور کی 6 میں سے 5 تحصیلیں حاصل پور، خیر پور، احمد پور شرقیہ بہاولپور سٹی و تحصیل صدر کے 100 سے زائد موضع جات کی 672 دیہات سیلاب سے شدید متاثر ہوئے۔ ان میں عباسی نگر، لال سوہانزا، جھانگی والہ، دھوڑ کوٹ، سمہ سٹہ، موضع کالڑہ، لشکر گوٹھ، باقر پور خانو والی، ماڑی قاسم شاہ، موضع کڑپال، موضع کوٹ مادو گھلو، موضع وڑ میلاں، ٹھل حمزہ، بیٹ ظاہر پیر، نور والا، بلہ جھلن، جھانگڑہ شرقی کے زمیندارہ بند ٹوٹ گئے جس کی وجہ سے سینکڑوں بستیاں دریا برد ہوئیں اور 2 لاکھ کے قریب لوگ متاثر ہوئے۔ پنجاب حکومت اور ڈسٹرکٹ انتظامیہ کے ادارے محکمہ آبپاشی، محکمہ مال، محکمہ ہیلتھ، پنجاب پولیس اور ریسکیو سروس 1122 کے اہلکار سیلاب کے خدشہ کے پیش نظر دریا کے بیٹ اور نشیبی علاقوں کے رہائشیوں کو محفوظ مقامات پر منتقل ہونے کے اعلانات کرتے رہے مگر اکثریت نے محفوظ مقامات پر جانے سے انکار کر دیا۔ ڈسٹرکٹ انتظامیہ نے بہاولپور کے سیلاب متاثرین کیلئے 34 ریلیف کیمپس جو کہ سکولوں اور ہیلتھ مراکز میں تھے قائم کیئے جہاں پر ضلعی انتظامیہ کا عملہ، نمبردار و پٹواری سے لیکر افسران تک موجود رہے لیکن دیہاتی حدود کے مراکز ریلیف کیمپ پر سیلاب متاثرین کی بہت کم تعداد نے رہائش رکھی۔ اکثر اوقات کھانے کے وقت رش بڑھ جاتا تھا کیونکہ اکثریت نے اپنے رشتہ داروں یا محفوظ سرکاری بندوں پر ڈیرے لگائے ہوئے تھے۔ نامہ نگار کو سیلاب متاثرین نے شکایت کی کہ ہمیں ٹینٹ فراہم نہیں کئے جا رہے ہم دُور قائم کئے گئے کیمپوں میں رہائش کیلئے نہیں جا سکتے۔ محمد اعجاز نے بتایا کہ ان کے گھر سیلاب سے ڈوب چکے ہیں، کھانا نہیں دیا جا رہا، چند من پسند لوگوں کو ملتا ہے جسکی نمبردار اور پٹواری تک رسائی ہے۔ نامہ نگار کو مختیار احمد نے بتایا کہ ہمارے پاس ریسکیو کے اہلکار تو موجود ہیں مگر ان کے پاس کشتیاں نہیں، لوگ اپنی مدد آپ کے تحت اپنے جانوروں اور قیمتی سامان کے ہمراہ ہجرت کر رہے ہیں۔ محمد عاشق نے شکایت کی کہ اس کے علاقہ میں دو افراد کے پاس کشتی ہے جو اپنی مرضی کا کرایہ وصول کر رہے ہیں۔ جن کے پاس استطاعت ہے وہ تو محفوظ مقامات پر پہنچ گئے ہیں۔ محمد وقاص نے نامہ نگار کو بتایا کہ اس کا موضع وڑ ہیلاں 90 فیصد پانی میں ڈوب چکا ہے، فصلیں دریا برد ہو چکی ہیں، اور لوگ سڑکوں پر رہائش پذیر ہیں۔ حکومتی امداد میسر ہے اور نہ ہی غیر سرکاری تنظیمیں ہمارے علاقہ میں آئی ہیں۔ زوار حسین نے بتایا کہ وہ کئی دن سے سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں بچوں کو خارش اور جسم پر دانے نکل آئے ہیں مگر علاج معالجہ کی سہولت نہیں۔ محمد مدنی نے شکایت کی کہ حکومت ان کے ساتھ سوتیلا سلوک کر رہی ہے۔ شہروں کو بچانے کیلئے تمام سرکاری مشینری کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور جان بوجھ کر ان کے گاؤں کو ڈبویا جا رہا ہے۔ محمد جاوید نے کہا کہ ایم این اے نے اپنے ووٹروں اور سپوٹروں کو بند مضبوط بنانے کیلئے رقم دی ہے مگر ان کے بند کیلئے رقم نہیں دی کیونکہ ہم نے انہیں ووٹ نہیں دیا۔ گل محمد نے الزام لگایا کہ مقامی انتظامیہ منتخب نمائندوں کی خواہش پر اپنے پسندیدہ علاقوں کے متاثرین کو ریسکیو کروا رہے ہیں جبکہ ہم پرائیوٹ کشتیوں کے ذریعے ہزاروں روپے خرچ کر کے محفوظ مقامات پر منتقل ہوئے۔ محمد اسلم نے بتایا کہ ہمیں اپنے جانوروں کیلئے خشک چارہ کی ضرورت ہے۔ ہر منٹھار کے رہنے والوں کا سرمایہ حیات ہمارے جانور ہوتے ہیں اور ان کی بھوک ہم سے سہی نہیں جاتی ہے۔ ملک فاروقی نے بتایا کہ غیر سرکاری تنظیم الخدمت فاؤنڈیشن اور منہاج نے ہمیں دو دن کھانا اور پینے کا پانی دیا جبکہ شاہین رورل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کے جانوروں اور قیمتی سامان نکالنے کیلئے ٹریکٹر ٹرالی مہیا کی۔

مشاہدات:

1۔ پنجاب کے تین دریاؤں میں بیک وقت سیلاب آیا جسکی وجہ سے مالی نقصان زیادہ ہوا تا ہم جانی نقصان کم ہوا۔

2۔ دریا کے کناروں پر آباد لوگوں نے حکومتی معلومات پر اعتبار نہیں کیا جسکی وجہ سے بیٹ کے لوگوں نے اپنے گھروں کو نہیں چھوڑا۔

3۔ لینڈ مافیا نے حد کر دی ہے اور انہوں نے دریائی رقبوں پر قبضہ کر کے سولر ٹیوب ویلوں سے رقبہ پر فصلیں کاشت کر رکھی ہیں۔

4۔ دریا کے بیٹ و نشیبی علاقوں کے لوگوں نے مختلف جگہوں پر چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد کر رکھی اور اپنی بستی کو سیلاب سے بچانے کیلئے بند بنا رکھے ہیں جو سیلابی پانی کی رکاوٹ بنتے ہیں۔

سفارشات

1۔ زمیندارہ بندوں کو ہر صورت ختم کیا جائے۔

2۔ سرکاری بندوں کو مزید اونچا کیا جائے اور پختہ بھی بنایا جائے اور ان کے کناروں پر دونوں طرف سے درخت لگائے جائیں۔

3۔ حکومت غیر سرکاری تنظیمیں کو امدادی کیمپ لگانے سے نہ روکے۔

4۔ دریائی بیٹ کے علاقوں اور نشیبی علاقوں کے ہائشیوں کو محفوظ علاقوں میں منتقل کرنے کے فوری انتظامات کئے جائیں۔

5۔ دریائی بیٹ کی زمینیں جو غیر قانونی طور پر لوگوں کے قبضہ میں ہیں یا انہیں منتقل کی گئی ہیں فوراً واپس لی جائیں تا کہ قبضہ مافیا انہیں کاشت نہ کر سکیں جسکی وجہ سے سیلابی پانی واپس پلٹتا ہے اور زیادہ تباہی ہوتی ہے۔

6۔ نہروں اور بندوں کے کنارے درختوں کی آبیاری و حفاظت کا کام محکمہ جنگلات کی بجائے محکمہ انہار کے ذمہ لگایا جائے کیونکہ ان کے پاس وسائل بھی ہیں اور درخت بھی ٹمبر مافیا سے محفوظ رہیں گے۔

7۔ حکومت سیلاب متاثرین کو کم از کم 50 ہزار روپے فی ایکٹر معاونت کرے۔ بہاولپور میں چولستان کو سرسبز شاداب بنانے کے لیے قیام پاکستان کے قبل تین عدد نہریں بنائی گئی تھیں۔ حکومت ان نہروں میں سیلاب کے دنوں میں پانی چھوڑنے کا انتظام کرے۔

(خواجہ اسداللہ)

بچے

بچوں کی مار پیٹ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جانا چاہیے، ڈبلیو ایچ او

----- عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) نے بتایا ہے کہ دنیا بھر میں 18 سال سے کم عمر کے نصف سے زیادہ بچوں کو جسمانی سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے ان پر ذہنی، سماجی اور جذباتی اعتبار سے دوررس منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ادارے کی جاری کردہ نئی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہ بچے عام طور پر والدین، اپنی دیکھ بھال کرنے والوں اور اساتذہ کی جانب سے مار پیٹ کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایسی سزائیں زیادہ تر گھروں اور سکولوں میں دی جاتی ہیں جس سے بچوں کی دماغی نشو و نما متاثر ہوتی ہے۔'ڈبلیو ایچ او' میں شعبہ عوامل صحت کی ڈائریکٹر ایٹینی کروگ نے بتایا ہے کہ جسمانی سزا سے بچوں کے رویے، ترقی یا بہبود پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے والدین یا معاشروں کو کسی طرح کا کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ کئی دہائیوں میں بہت سے تحقیقی جائزوں سے ثابت ہوا ہے کہ جسمانی سزا کے بچوں کی صحت پر انفرادی اور معاشرے پر مجموعی طور پر دیرپا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ایسے واضح سائنسی شواہد موجود ہیں کہ جسمانی سزا بچوں کی صحت کے لیے کئی طرح کے خطرات کا باعث بنتی ہے۔**جسمانی سزا کے نقصانات:** متوسط آمدنی والے 49 ممالک میں لیے گئے جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ جسمانی سزا کا سامنا کرنے والے بچوں کے اپنے ہم عمر ساتھیوں کے مقابلے میں آگے بڑھنے کے امکانات 24 فیصد کم ہوتے ہیں۔یہ سزا بچوں کو نہ صرف فوری جسمانی نقصان پہنچاتی ہے بلکہ ان میں ہارمونی دباؤ کو بھی بڑھا دیتی ہے جس سے ان کے دماغ کی ساخت اور کارکردگی میں تبدیلی آ جاتی ہے اور یہ اثرات زندگی بھر قائم رہ سکتے ہیں۔معاشرتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جسمانی سزا کا سامنا کرنے والے بچے بڑے ہو کر اپنے ہی بچوں کے ساتھ یہی رویہ اپناتے ہیں جس سے تشدد کا نسل در نسل سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔اس طرح، بچپن میں جسمانی سزا سہنے والے بالغ افراد میں پر تشدد، مجرمانہ اور جارحانہ رویہ پیدا ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔**علاقائی فرق:** اگرچہ جسمانی سزا دنیا بھر میں رائج ہے تاہم علاقائی حوالے سے اس کے اطلاق میں فرق پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر، یورپ اور وسطی ایشیا میں تقریباً 41 فیصد بچوں کو گھروں میں جسمانی سزا دی جاتی ہے جبکہ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں یہ شرح 75 فیصد تک ہے۔سکولوں میں جسمانی سزاؤں کو دیکھا جائے تو یہ فرق اور بھی نمایاں ہے۔مغربی بحرالکاہل کے صرف 25 فیصد بچے تعلیمی دور میں جسمانی سزا کا سامنا کرتے ہیں جبکہ افریقہ اور وسطی امریکہ میں یہ شرح 70 فیصد سے زیادہ ہے۔لڑکیوں اور لڑکوں کو جسمانی سزا دیے جانے کے امکانات تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں تاہم اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔جسمانی معذور بچوں کے ایسی سزاؤں کا نشانہ بننے کا خدشہ زیادہ ہوتا ہے۔علاوہ ازیں، غربت، معاشی مسائل یا نسلی امتیاز کا شکار لوگوں کے بچوں کو جسمانی سزا دیے جانے کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ **آگاہی مہمات کی ضرورت:** رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جسمانی سزا پر پابندی عائد کرنا ضروری ہے لیکن یہی کافی نہیں۔جائزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قانونی پابندیوں سے جسمانی سزا کی شرح میں کوئی کمی نہیں آتی۔اس وقت 67 ممالک نے گھروں اور سکولوں میں بچوں کو جسمانی سزا دینے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔'ڈبلیو ایچ او' اس ممانعت کے بہتر طور سے اطلاق کے علاوہ آگاہی مہمات کے ذریعے اس سزا کے نقصانات کو اجاگر کرنے پر بھی زور دے رہا ہے۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جسمانی سزا کے مسلسل استعمال اور اس کی ضرورت پر عام یقین کے باوجود اس کی ممانعت سے متعلق قوانین بنانے اور ان پر عملدرآمد کی کوششوں کے ساتھ آگاہی مہمات بھی چلائی جانا چاہئیں۔ایٹینی کروگ نے کہا ہے کہ اگر والدین کو جسمانی سزاؤں کے مثبت متبادل کا علم ہو تو وہ انہیں ضرور اپنائیں گے۔اب اس نقصان دہ عمل کا خاتمہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بچے ترقی پائیں اور اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لینے کے قابل ہوں۔ (بشکریہ یو این خبر نامہ)

اقلیتیں

احمدی خاتون کی تدفین مقامی قبرستان میں نہ ہو سکی

سیالکوٹ تھانہ موترہ ضلع سیالکوٹ کی حدود میں واقع پیرو چک میں احمدی خاتون کی تدفین مقامی قبرستان میں نہ ہو سکی۔انتہا پسندوں کی اشتعال انگیزی پر انتظامیہ نے چار دن بعد 14 کلومیٹر دور قبرستان میں تدفین کرائی۔تفصیلات کے مطابق پیرو چک ضلع سیالکوٹ میں گزشتہ اڑھائی سال سے احمدیوں کو تدفین نہیں کرنے دی جا رہی۔اس عرصہ کے دوران 6 سے زائد احمدیوں کی تدفین دور دراز علاقوں میں کرنا پڑی۔واضح رہے کہ اس قبرستان کی الاٹمنٹ قیام پاکستان کے بعد احمدیوں کو ہوئی تھی۔یہاں پہلے سے آباد دیگر مسالک سے وابستہ مقامی برادری کو دوسرے مسالک کے افراد نے اپنے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا تو جماعت احمدیہ کے افراد نے انسانی ہمدردی کے تحت انہیں اپنے قبرستان میں تدفین کی اجازت دی۔جو 2022 تک جاری رہی۔ اس قبرستان میں احمدی افراد کی قبروں کی تعداد 220 ہے جبکہ دیگر مسالک کے 100 کے قریب افراد دفن ہیں۔21 ستمبر 2025 کو احمدی خاتون قدسیہ تبسم صاحبہ عمر 55 سال کی وفات ہوئی۔انتہا پسندوں نے ان کی تدفین میں رکاوٹ ڈالی۔حالات کے پیش نظر تین دن بعد سرکاری انتظامیہ کے کہنے پر گزشتہ رات ان کی میت کو تدفین کے لئے قریبی علاقے بھڈال لے کر جانے لگے تو شر پسند عناصر نے اشتعال انگیزی کی اور نعرے بازی شروع کر دی اور احمدیوں پر حملہ کر دیا۔جس کے نتیجے میں دونوں اطراف سے کچھ افراد زخمی ہوئے۔مشتعل ہجوم نے احمدی گھروں پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی۔احمدیوں کی املاک اور دکانوں کو نقصان پہنچایا اور ایک احمدی کی موٹر سائیکل کو نذر آتش کر دیا۔پولیس نے احمدیوں کی دادرسی کی بجائے تھانہ موترہ میں 11 نامزد اور 20 نامعلوم احمدی افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔ (عامر محمود)

ڈیروں اور دکانات کو آگ لگا دی

سیالکوٹ 28 ستمبر کو تھانہ موترہ ضلع سیالکوٹ کی حدود میں واقع پیرو چک میں انتہا پسندوں نے احمدیوں کے ڈیروں اور دکانات کو آگ لگا دی۔ایک ڈیرے پر کار ٹریکٹر اور کیری ڈبہ موجود تھا اس کو بھی آگ لگائی گئی۔احمدیوں پر فائرنگ کی گئی جس سے ایک احمدی گولی لگنے سے زخمی ہوا جبکہ دیگر پانچ احمدی شدید زخمی ہوئے۔اس واقعہ کے متعلق پولیس نے سب انسپکٹر عامر علی سندھو کی مدعیت میں ایف آئی آر نمبر 1552 درج کی ہے اور ایف آئی آر میں بیان کیا گیا کہ 31 نامزد اور دو سے اڑھائی سو نامعلوم افراد پر مشتمل ہجوم نے احمدیوں پر حملہ کیا۔ایف آئی آر میں وجہ عناد بیان کی گئی ہے کہ اس گاؤں میں ایک احمدی خاتون قدسیہ تبسم رضائے الٰہی سے انتقال کر گئی تھیں۔جن کی تدفین میں رکاوٹ ڈالی گئی اور احمدیوں کے خلاف مذہبی منافرت اور دشمنی کو فروغ دے کر امن و امان کی صورتحال خراب کر دی گئی۔ (عامر محمود)

☆ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:			
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال	مہینہ	تاریخ
3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں	محلّہ	
	ڈاک خانہ	تحصیل وضلع	
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم و رواج سے تعلق ہے	ہاں	نہیں	
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)			
6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل			
7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام	ولد / زوجہ	پیشہ

8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی / سماجی حیثیت	بچہ / بچی	عورت / مرد	غریب /ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کا رکن	دیگر (تخصیص کریں)	

9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت / زوجیت	عہدہ	پیشہ
	-1			
	-2			
	-3			

10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد / افراد کی معاشی / سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار / زمیندار / بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے / غریب آدمی	بااثر صلاحیت / سیاسی اثر و رسوخ

11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی / ادارہ
	-1			
	-2			
	-3			

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان و غیر جانبدار افراد کے کوائف و موقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق / رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار / پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں
14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ	

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار / اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے / والوں کی رائے			
رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں / محلّہ	شہر / ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: ....

تاریخ: ....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آ سکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆ تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف پُر کر کے بھیجیں

Human Rights Commission of Pakistan

جہدِ حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق جہدِ حق کے تمام قارئین کو آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ یہ رسالہ مفت ہے۔ قارئین کو کسی قسم کی قیمت ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1: تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2: ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔
اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقتدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3: ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4: کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہو گی۔

دفعہ - 5: کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6: ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7: قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8: ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، با اختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9: کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10: ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11: (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔
(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12: کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13: (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔
(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14: (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔
(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15: (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔
(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16: (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔
(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہو گا۔
(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17: (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔
(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18: ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19: ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20: (1) ہر شخص کو پر امن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔
(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21: (ا) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔
(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔
(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہو گی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22: معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشو نما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23: (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔
(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔
(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔
(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24: ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25: (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔
(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26: (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہو گی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہو گی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہو گا۔
(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشو نما ہو گا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہو گی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔
(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27: (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔
(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں۔

دفعہ - 28: ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29: (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشو و نما ممکن ہے۔
(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہو گا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔
(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30: اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

HRCP

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
”ایوان جمہور“ 107۔ ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15

کمپوز:
جمال احمد
سید رضا شاہ